www.cpsglobal.org

December 2018 • Rs. 30

کسی اصلاحی عمل کے لیے صحیح نقطۂ آغاز، اقدام
نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ لوگوں کا ذہن بنایا جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جاری کردہ 1976

Vol. No. 42 Issue No. 12 دسمبر 2018

Retail Price	Rs 30/- per copy
Subs. by Book Post	Rs 300/- per year
Subs. by Reg. Post	Rs 400/- per year
International Subs.	USD 20 per year

Electronic Money Order (eMO)

Al Risala Monthly
1, Nizamuddin (W), Market
New Delhi-110 013

Bank Details

Al-Risala Monthly
Punjab National Bank
A/C No. 0160002100010384
IFSC Code: PUNB0016000.
Nizamuddin West Market
New Delhi - 110013

Customer Care Al-Risala

Call/Whatsapp/SMS: **+91-8588822679**

Ph. No. **011 41827083**

cs.alrisala@gmail.com

www.cpsglobal.org

Goodword Customer Care

+9111-46010170

+91-8588822672

sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

فہرست

Printed and Published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd., A46-47, Sector 5, Noida-201301, UP.
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013. Editor: Saniyasnain Khan
Total Pages: 52

کامیاب زندگی کا طریقہ

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: مَا طَلَعَتْ شَمْسٌ قَطُّ إِلَّا بُعِثَ بِجَنْبَتَيْهَا مَلَكَانِ يُنَادِيَانِ، يُسْمِعَانِ أَهْلَ الْأَرْضِ إِلَّا الثَّقَلَيْنِ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ هَلُمُّوا إِلَى رَبِّكُمْ فَإِنَّ مَا قَلَّ وَكَفَى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَأَلْهَى (مسند احمد، حدیث نمبر 21721)۔ یعنی جب سورج طلوع ہوتا ہے تو دو فرشتے اس کے دونوں کناروں پر بھیجے جاتے ہیں۔ وہ دونوں اعلان کرتے ہیں، جس کو جن وانسان کے علاوہ تمام مخلوقات سنتی ہیں: اے لوگو، اپنے رب کی طرف آؤ، جو کم ہو، اور کافی ہو، وہ بہتر ہے اس سے جو زیادہ ہو، اور غفلت میں ڈال دے۔

انسان کو زندگی گزارنے کے لیے کچھ مادی سامانِ حیات درکار ہوتا ہے۔ یہ سامان حیات زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن سامانِ حیات فراہم کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے، بقدرِ ضرورت پر اکتفا کرنا، اور دوسرا ہے، ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرنا۔ جو آدمی سامانِ حیات کے معاملے میں بقدرِ ضرورت پر اکتفا کرے، وہ کامیاب انسان ہے، اور جو آدمی ہر خواہش کی تکمیل کو اپنا مقصدِ حیات بنالے، وہ کامیاب زندگی کی تعمیر سے محروم رہے گا۔

جو آدمی سامان حیات کو ضرورت کے درجے میں رکھے، اور اپنی ساری توجہ مقصدِ حیات کو جاننے پر لگائے، اس کی زندگی کامیاب زندگی ہوگی۔ کیوں کہ ضرورت پر اکتفا کرنے پر اس کو کافی موقع ملے گا کہ وہ زندگی کے اصل مقصد کے حصول کے لیے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ فارغ کرسکے۔

مثلاً ایسے آدمی کے پاس کافی وقت ہوگا۔ وہ کتابوں کا مطالعہ کرکے زندگی کے مقصد کے بارے میں اپنے علم کو بڑھائے۔ اس کے برعکس، جو آدمی سامانِ حیات کو بذاتِ خود اہم سمجھ لے، وہ سامانِ حیات کی زیادہ سے زیادہ فراہمی میں اتنا وقت لگادے گا کہ اس کے پاس اصل مقصد کے لیے کچھ کرنے کا وقت ہی باقی نہیں رہے گا۔ اس کے پاس سامان حیات کی افراط ہوگی، لیکن انٹلکچول ڈیولپمنٹ کے معاملے میں وہ ذہنی بونا پن کا شکار ہوجائے گا۔

آخرت کا معاملہ

ایک لمبی روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: أَمَّا هُوَ فَقَدْ جَاءَهُ اليَقِينُ، إِنِّي لَأَرْجُو لَهُ الخَيْرَ مِنَ اللَّهِ، واللَّهِ مَا أَدْرِي - وَأَنَا رَسُولُ اللَّهِ - مَا يُفْعَلُ بِي وَلاَ بِكُمْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7018)۔ یعنی اس کو موت آ گئی، اور میں اس کے بارے میں اللہ سے خیر کی امید رکھتا ہوں، خدا کی قسم، میں نہیں جانتا، حالاں کہ میں اللہ کا رسول ہوں، کیا کیا جائے گا میرے ساتھ، اور کیا کیا جائے گا تمھارے ساتھ۔ اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، وہ بظاہر اس آیت کے خلاف ہے: لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (48:2)۔ لیکن یہ کوئی تعارض کی بات نہیں۔ اس آیت میں جو بات بتائی گئی ہے، وہ خدا کی جانب سے ہے۔ اس کے برعکس، ایک انسان کا خدا کی نسبت سے کیا رسپانس ہونا چاہیے، وہ رسول اللہ نے کہا ہے۔ ایک سچا انسان جب خدا کے عطیے کو پائے، اس کے تواضع میں بہت زیادہ اضافہ ہوجائے گا، وہ سجدے میں گرجائے گا، وہ یہ کہے گا کہ خدایا، میں تو اس قابل نہیں تھا، یہ محض تیرا فضل ہے، تیرے ہاتھ میں سب کچھ ہے، اور میں کچھ بھی نہیں۔

مذکورہ روایت میں رسول اللہ نے جو بات کہی، وہ عظمتِ خداوندی کے پہلو سے ہے، جس کو قرآن میں ایک مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ (82:19)۔ جس انسان کو رب العالمین کی عظمتوں کی دریافت ہوجائے، وہ ہر کام کو صرف اللہ رب العالمین کی نسبت سے سوچنے والا بن جاتا ہے۔ ہیبتِ خداوندی کی بنا پر اس کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو لے کر نہیں سوچتا، بلکہ اللہ رب العالمین کو لے کر سوچنے لگتا ہے۔ سچے انسان کو جب اللہ کی دریافت ہوجائے، تو اس کے اندر کامل معنوں میں خدا رخی (God oriented) سوچ بن جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ''بے کچھ'' اور اللہ رب العالمین کو ''سب کچھ'' سمجھنے لگتا ہے۔ اس کی یہ سوچ اس کے تمام اقوال وافعال میں حاوی ہوجاتی ہے۔

حجت کا قانون

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے دنیا کو پیدا کرنے کے بعد یہاں انسان کو آباد کیا، اور پیغمبر اور داعیوں کے ذریعے یہ انتظام فرمایا کہ انسانوں کے پاس مسلسل طور پر ایسے افراد آئیں، جو انسان کو بتائیں کہ خالق کا تخلیقی نقشہ (creation plan) کیا ہے۔ یہ انتظام اس لیے کیا گیا ہے، تا کہ انسان کو پیشگی طور پر پوری بات معلوم ہوجائے، اور وہ اس کے مطابق زندگی گزار کر جنت کے انعام کا اپنے آپ کو مستحق بنائے۔ اسی بات کو مزید تاکید کی زبان میں بتاتے ہوئے یہ کہا گیا: رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (4:165)۔ یعنی اللہ نے رسولوں کو خوش خبری دینے والے اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا، تا کہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت (excuse) باقی نہ رہے۔

یہ کوئی فقہی نوعیت کا حکم نہیں ہے، یعنی کوئی ایسا حکم جس کا لوگوں میں صرف اعلان کر دینا کافی ہے۔ مثلاً یہ کہ اے لوگو، تم لوگ ہر سال ایک مہینے کا روزہ رکھو۔ بلکہ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اجتہادی حکم ہے۔ یعنی ہمیشہ حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ حکم کا تطبیقی مفہوم (applied meaning) دریافت کرتے رہنا ہے۔ ہمیشہ حالات کی رعایت کرتے ہوئے حکم کو اس طرح بتاتے رہنا ہے کہ لوگوں کو حکم اپنے زمانے کے لحاظ سے قابلِ اتباع معلوم ہو۔ حکم کی وضاحت اس طرح کرنا ہے کہ ہر زمانے میں انسان کا ذہن برابر ایڈریس ہوتا رہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ آیت کسی جامد مفہوم میں نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک انفرادی حکم میں ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ بتانے والا ہمیشہ اس کو اس طرح بتائے کہ زمانے کے لوگوں کا ذہن اس سے ایڈریس ہوتا رہے۔ اس حکم میں حجت شامل ہے، یعنی بتانے والا حکم کو اس طرح بتائے کہ جس سے سننے والے کا ذہن مطمئن ہو۔ وہ یقین کی اسپرٹ کے ساتھ اس پر برابر کاربند ہوتا رہے۔

ایک حدیث قدسی

احادیثِ قدسی ان حدیثوں کو کہتے ہیں، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالی سے بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک حدیثِ قدسی ان الفاظ میں آئی ہے: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ عَنِ اللَّهِ جَلَّ وَعَلَا: الْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي وَالْعَظَمَةُ إِزَارِي، فَمَنْ نَازَعَنِي فِي شَيْءٍ مِنْهُ أَدْخَلْتُهُ فِي النَّارِ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 5672)۔ یعنی عبداللہ ابن عباس رسول اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالی نے کہا: کبریائی میری چادر ہے، اور عظمت میرا ازار ہے، جس نے بھی ان میں سے کچھ بھی چھیننے کی کوشش کی، میں نے اس کو جہنم میں داخل کیا۔

اس حدیث میں رداء اور ازار کا لفظ تمثیلی طور پر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عظمت اور بڑائی تمام تر اللہ رب العالمین کا حق ہے۔ کوئی آدمی جو اپنی بڑائی میں جیے، اور کچھ بھی عظمت کا دعویٰ کرے، تو اللہ اس کو جہنم میں ڈال دے گا۔ یہ بے حد ڈرانے والی حدیث ہے۔ ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ اس معاملے میں بے حد محتاط رہے۔ حقیقی عظمت (real greatness) صرف اللہ رب العالمین کا حق ہے۔ انسان کے لیے تواضع ہے۔ انسان کو اس دنیا میں احساسِ برتری کے ساتھ نہیں رہنا ہے، بلکہ اس کو ہمیشہ احساسِ کمتری کے ساتھ اس دنیا میں زندگی گزارنا ہے۔ جو لوگ حقیقت پسندانہ انداز اختیار کریں، اور حقیقت پسندی کی روش اختیار کرتے ہوئے متواضع انسان بن کر رہیں، ان کو اللہ کی طرف سے انعام ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے اس کا اچھا بدلہ پائیں گے۔

اس کے برعکس، جو لوگ حقیقتِ واقعہ کے خلاف دنیا میں بڑے بن کر رہنا چاہیں، ان کا انجام آخر کار ذلت کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کا احساسِ برتری کچھ بھی ان کے کام نہ آئے گا۔ آخر کار وہ دیکھیں گے کہ ان کی خود ساختہ عظمت ان کے کچھ کام نہ آئی۔ وہ ذلت وخواری کا کیس بن کر رہ گئے۔ عزت اس کے لیے ہے، جس کو اللہ رب العالمین عزت دے۔ جو شخص بطور خود اپنے کو عزت والا سمجھ لے، اس کو اللہ کی اس دنیا میں کچھ بھی ملنے والا نہیں۔

کنڈیشننگ کا مسئلہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے آلِ فرعون کے سامنے اپنی دعوت کو معجزاتی انداز میں پیش کیا، لیکن وہ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا: مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ (7:132)۔ یعنی ہم کو مسحور کرنے کے لیے تم خواہ کوئی بھی نشانی لاؤ، ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حضرت موسیٰ کا استدلال اپنے آپ میں کوئی کمزور استدلال تھا۔ حضرت موسیٰ کا استدلال پوری طرح ایک طاقت ور استدلال تھا۔ لیکن انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنی کنڈیشننگ کو توڑ کر سوچ نہیں پاتا۔ حقیقت کے اعتبار سے وہ کنڈیشننگ میں جیتا ہے، لیکن بطور خود یہ سمجھتا ہے کہ میں ایک ثابت شدہ حقیقت پر جی رہا ہوں۔ یہ خود فریبی انسان کے لیے ہمیشہ سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی ہے۔

حدیث میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کے گھر کا ماحول اس کو کنڈیشننگ کا شکار بنا دیتا ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1385)۔ یہ کنڈیشننگ بلاشبہ ہر انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہر انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی کنڈیشننگ کو ختم کرے۔ وہ اپنے آپ کو مسٹر کنڈیشنڈ کے بجائے، مسٹر ڈی کنڈیشنڈ بنائے۔ جو آدمی ایسا نہ کر سکے، وہ سچائی کو قبول کرنے میں ناکام ہو جائے گا۔ خواہ رسول کا زمانہ ہو یا رسول کے بعد کا زمانہ۔

کنڈیشننگ کا ایک نقصان یہ ہے کہ آدمی ذہنی جمود (intellectual stagnation) کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ڈی کنڈیشنڈ آدمی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے، اس بنیاد پر وہ سچائی کو اس کی درست شکل میں دیکھتا ہے، اور اس کو قبول کر لیتا ہے۔ ہر آدمی کی یہ ایک اہم ذمے داری ہے کہ وہ اپنی کنڈیشننگ کو دریافت کرے، اور وہ سیلف ہیمرنگ کے ذریعے اپنے آپ کو کنڈیشننگ سے فری انسان بنائے۔

ماحول کا اثر

ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ، أَوْ يُنَصِّرَانِهِ، أَوْ يُمَجِّسَانِهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1385)۔ یعنی ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اس کو یہودی بنا دیتے ہیں، یا نصرانی، یا مجوسی۔

اس حدیثِ رسول میں والدین سے مراد قریبی ماحول ہے۔ ہر آدمی کسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ صرف ایک بچہ ہوتا ہے، یعنی ناپختہ انسان (immature human being)۔ فطرت کے اعتبار سے ہر آدمی اپنی زندگی کا آغاز ناپختگی سے کرتا ہے۔ اس لیے ہر آدمی ماحول سے اثر قبول کرکے ماحول کی پیداوار (product) بن جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اپنے فطری حالات کی بنا پر ہر انسان لازمی طور پر ایک متاثر ذہن کا انسان (man of conditioning) بن جاتا ہے۔

اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ہر آدمی اپنا بے لاگ محاسبہ (introspection) کرے۔ اس پراسس میں وہ اپنی کنڈیشننگ کو دریافت کرے، اور ایک ایک کرکے اپنی کنڈیشننگ کو توڑے، اور اس طرح اپنے آپ کو کنڈیشننگ سے نکال کر ایک ڈی کنڈیشنڈ انسان بنائے۔ کنڈیشننگ کا یہ واقعہ ہر انسان کی زندگی میں ایک فطری قانون کے تحت پیش آتا ہے۔ لیکن اسی طرح اس معاملے میں اصلاحِ فطرت کا قانون بھی ہے۔ اگر آدمی اس فطری قانون کو استعمال کرے تو خود فطرت اس کی معلم بن جائے گی۔ اس کے ذہن میں اپنے آپ ایک جوابی کنڈیشننگ (counter conditioning) کا عمل شروع ہوجائے گا۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے وہ مکمل معنوں میں ایک ڈی کنڈیشنڈ انسان بن جائے گا۔

مومن کی فراست

ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللهِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3127)۔ یعنی مومن کی فراست سے بچو، کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ دانش مند آدمی کے ساتھ چالبازی سے بچو۔

مومن وہ ہے جو اللہ رب العالمین کے نقشۂ تخلیق (creation plan) کو دریافت کرتا ہے۔ وہ فطرت کے اصولوں کی بنیاد پر اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔ اس کا ارتقا اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ چیزوں کو خالق کائنات کی روشنی میں دیکھ سکے۔ یہ چیزیں مومن کو اعلیٰ معنوں میں دانش مند بنا دیتی ہے۔ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ حکمت (wisdom) کی روشنی میں اپنے معاملات کو حل کرے۔

دانش مندی کیا ہے۔ دراصل فطرت کے قوانین کی پابندی کرنے کا نام ہے۔ جو آدمی اس معنی میں دانش مند ہو، وہ ایک ناقابلِ تسخیر انسان بن جاتا ہے۔ وہ ان کمزوریوں سے پاک ہوتا ہے جو کسی انسان کو کمزور شخصیت (weak personality) بنانے والی ہیں۔ اس کی بنا پر کوئی انسان جذباتیت کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو اس سے بچا لیتا ہے کہ شیطان اس کو اپنی تزئینات کا شکار کرلے، اور اس کو تباہی کے راستے پر چلنے والا بنا دے۔

فراستِ مومن سے مراد وہ فراست ہے جو اللہ رب العالمین کی دریافت سے بنے۔ جو اللہ کے قائم کردہ فطری قوانین پر مبنی ہو۔ ایسا انسان غلط منصوبہ بندی سے بچ جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ کسی کی سازش کا شکار ہونے سے بچ جائے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دانش مند آدمی کسی بھی بات کو ایز اٹ از (as it is) نہیں قبول کرتا، بلکہ وہ اس کو دیکھتا ہے، اس میں غور وفکر کرتا ہے، معاملے کی اسکروٹنی (scrutiny) کرتا ہے، پھر وہ اس کو قبول کرتا یا رد کرتا ہے۔ اس بنا پر وہ اپنے آپ کو غیر ضروری مسائل سے بچا لیتا ہے۔

داخلی اصلاح کا نظام

فطرت (nature) خالق کی ایک تخلیق ہے۔اس موضوع پر قرآن کی مختلف آیتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کا جو مطلب سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ فطرت کوئی پر اسرار چیز نہیں، وہ انسان کے لیے ایک معلوم حقیقت ہے۔فطرت ہر موقعے پر انسان کو الارم دیتی ہے کہ وہ کیا کرے، اور کیا نہ کرے۔فطرت کے بارے میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (30:30)۔یعنی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔اسی طرح قرآن میں آیا ہے: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (91:8)۔یعنی پھر اس کو سمجھ دی، اس کی بدی کی اور اس کی نیکی کی۔

فطرت ہر موقعے پر انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔لیکن یہ رہنمائی خاموش زبان (unspoken language) میں ہوتی ہے۔فطرت انسان کی صحیح گائڈ ہے۔وہ ہر موقعے پر انسان کو آواز دیتی ہے۔کیوں کہ انسان کے اندر بیک وقت دو فیکلٹی موجود ہیں، ایک اکاؤنٹیبل پرسنالٹی، اور دوسرا الارمنگ کانشنس (conscience)۔

اگر آدمی بر وقت اس آواز کو سن لے، تو وہ فوراً انسان کی رہنمائی کے لیے متحرک ہوجاتی ہے، اور اگر انسان فوراً متحرک نہ ہو، تو وہ انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی ہے۔فطرت کی یہ خاموش زبان اگرچہ انسان نہیں سنتا، لیکن ہر آدمی اس کو غیر واضح انداز میں فوراً محسوس کرلیتا ہے۔یہ واقعہ جو انسان کے اندر پیش آتا ہے، وہ دوسرے الفاظ میں وہی ہے جس کو ضمیر (conscience) کہا جاتا ہے۔

انسان کی شخصیت ایک آزاد شخصیت ہے۔وہ ردو قبول کا آزادانہ فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔فطرت یا ضمیر کا کام انسان کو صرف الارم دینا ہے۔یہ فطری الارم اپنے صحیح وقت پر بجتا ہے، اور انسان یقینی طور پر اس کو سنتا ہے۔اب یہ انسان کا اپنا چوائس (choice) ہے کہ وہ فطرت کی آواز کو سنے یا اس کا انکار کردے۔اس حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29)۔یعنی اور کہو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، پس جو شخص

چاہے اسے مانے اور جو شخص چاہے نہ مانے۔

جنت اور جہنم کا معاملہ بھی انھیں دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ فطرت کا نظام ہے جو ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود رہتا ہے۔ انسان اگر اس نظام کی پیروی کرے تو وہ ہمیشہ درست راستے پر چلے گا۔ وہ کبھی ڈی ریل (derail) ہو کر غلط راستہ اختیار نہیں کرے گا۔ اس نظام کو ایک اعتبار سے داخلی اصلاح کا نظام (system of internal correction) کہا جا سکتا ہے۔

****

اس دنیا میں آدمی جب کوئی کام کرتا ہے تو اگرچہ اس کو شروع کرنے والا وہ خود ہوتا ہے۔ مگر اس کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب کہ فطرت کا نظام بھی اس کے ساتھ موافقت کرے۔ فطرت کے نظام کی موافقت حاصل کیے بغیر، یہاں کوئی کام کبھی تکمیل کو پہنچنے والا نہیں۔

فطرت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تدریج کے اصول پر عمل کرتی ہے۔ وہ واقعات کو اچانک ظہور میں نہیں لاتی۔ اب انسان اگر فوراً اور جلد نتیجہ نکالنا چاہے تو وہ عملاً ممکن نہ ہوگا۔ کیوں کہ انسان کی رفتار تیز ہوگی اور فطرت کی رفتار تدریجی قاعدے کی بنا پر سُست۔ ایسی حالت میں آدمی کو اپنے کام میں فطرت کی موافقت حاصل نہ ہوگی۔ اس کا کام بننے کے بجائے صرف بگڑ کر رہ جائے گا۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ جو کام بھی کرنا چاہے، سب سے پہلے وہ فطرت کے نظام کا مطالعہ کرے۔ اس کے بارے میں وہ فطرت کے اصول کو معلوم کرے۔ اور پھر اس مطالعہ کی روشنی میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ یہی واحد طریقہ ہے جس کو اختیار کرکے کوئی شخص کامیابی کے ساتھ اپنے مقصد تک پہنچ سکتا ہے۔

کامیابی اور ناکامی دونوں کا معاملہ فطرت کے نظام سے جُڑا ہوا ہے۔ اِس دنیا میں فطرت سے مطابقت کرنے کا نام کامیابی ہے، اور فطرت کے خلاف چلنے کا نام ناکامی۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ پہلے فطرت کے نظام کو سمجھے اور اُس کے بعد اُس کے مطابق، وہ اپنے کام کی منصوبہ بندی کرے۔

بیدار ذہنی

قرآن میں ایک حکم ان الفاظ میں آیا ہے: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ (61:4)۔ یعنی اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کے راستے میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

اس آیت میں بظاہر قتال کا ذکر ہے۔ لیکن وسیع تر معنی میں اس سے مراد ہر قسم کی دینی جدو جہد ہے۔ وسیع تر معنی میں اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی مشن کے لیے اس طرح متحد ہو کر کوشش کرنا کہ آپ کا اختلاف ہرگز اس متحدہ جدو جہد کے لیے رکاوٹ نہ بنے۔

اجتماعی زندگی میں اختلاف کا پیش آنا، ایک فطری امر ہے۔ کوئی بھی اجتماعی معاملہ ہو، اس میں افراد کے درمیان اختلاف کی صورتیں ضرور پیش آتی ہیں۔ لیکن اہلِ ایمان ذہنی ارتقا کے اس درجے پر ہوتے ہیں کہ وہ ہر اختلاف کو مینج کر لیتے ہیں۔ وہ اختلاف کو کسی بھی حال میں دین کی اجتماعی جدو جہد کے لیے رکاوٹ بننے نہیں دیتے۔ اس کی ایک مثال دو صحابی کا یہ واقعہ ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ، قَالَ: كَانَ بَيْنَ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيدِ، وَبَيْنَ سَعْدٍ كَلَامٌ، قَالَ: فَتَنَاوَلَ رَجُلٌ خَالِدًا عِنْدَ سَعْدٍ، قَالَ: فَقَالَ سَعْدٌ: مَهْ، فَإِنَّ مَا بَيْنَنَا لَمْ يَبْلُغْ دِينَنَا (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 3810)۔ یعنی طارق بن شہاب روایت کرتے ہیں کہ خالد بن الولید اور سعد بن ابی وقاص کے درمیان کچھ تکرار ہو گئی۔ اس کے بعد ایک آدمی نے سعد کے پاس خالد کا بُرا ذکر کیا، تو سعد نے کہا: دور ہو جاؤ، ہمارے درمیان جو کچھ ہے، وہ ہمارے دین تک نہیں پہنچے گا۔

اسی اجتماعی اسپرٹ کا نام اختلاف کے باوجود متحد ہونا ہے۔ اس طرح کا کردار مینج کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی دو واقعے کو ایک دوسرے سے الگ رکھے، ذاتی اختلاف کا معاملہ الگ، اور مشن کے لیے اتحاد کا معاملہ الگ۔ جو لوگ اس اسپرٹ کے حامل ہوں، ان کا اتحاد کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

مطالعے کی افادیت

کتابوں کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ لیکن صرف کتابی مطالعہ کافی نہیں۔ ضروری ہے کہ قاری کی حیثیت ایک تیار ذہن (prepared mind) کی ہو۔ ایسا ہی قاری کتابوں کے مطالعے سے پورا فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔

مثلاً ابو بکر احمد بن مروان الدینوری المالکی (المتوفی 333ھ) نے اپنی کتاب میں اصحاب رسول کے تعلق سے لکھا ہے: وَكَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَّجِرُونَ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (المجالسہ وجواہر العلم، جزء 7، اثر نمبر 754)۔ یعنی اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم خشکی اور تری میں تجارت کیا کرتے تھے۔ اسی بات کو امام الغزالی (450-505ھ) نے اپنی معروف کتاب احیاء علوم الدین میں اس باب کے تحت نقل کیا ہے: فَضْلُ الْكَسْبِ وَالْحَثِّ عَلَيْهِ (کمائی کی فضیلت اور اس پر ابھارنا)۔

صحابہ کرام کی یہ صفت بلا شبہ بہت اہم ہے۔ لیکن اگر آپ ایسا کریں کہ اس بات کو کتاب میں پڑھیں، اور اس کو ایسا ہی لے لیں، جیسا کہ وہ نقل ہوئی ہے، تو آپ اس سے صرف یہ نتیجہ نکالیں گے کہ رزق کے حصول کا افضل طریقہ یہ ہے کہ آدمی تجارت کے ذریعے کمائی کرے۔ مگر یہ مطالعے کا کمتر طریقہ ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ کا مطالعہ اتنا وسیع ہو کہ آپ صحابہ کے بارے میں یہ جانتے ہوں کہ صحابہ آج کل کی اصطلاح میں مین آف مشن (man of mission) تھے۔ پیغمبرِ اسلام پورے معنوں میں مین آف مشن تھے، اور پیغمبر اسلام کی تعلیم کی بنا پر ہر صحابی عملاً مین آف مشن بنا ہوا تھا۔

اگر آپ اس حقیقت کو جانتے ہوں، تو آپ اقتباس کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکالیں گے کہ رسول اللہ کی دعوت کا طریقہ یہ تھا کہ ہر مومن کو تعلیم وتربیت کے ذریعے پورے معنی میں مین آف مشن بنا دیا جائے، تاکہ آدمی جس فیلڈ میں بھی ہو، وہ مین آف مشن کی طرح زندگی گزارے۔ وہ ہر حال میں بامقصد انسان کی حیثیت سے اپنے وجود کو برقرار رکھے۔

اتباع کا مطلب

اکثر سلفی حضرات یہ اصول بیان کرتے ہیں کہ كُلُّ خَيْرٍ فِي اتِّبَاعِ مَنْ سَلَفَ، وَكُلُّ شَرٍ فِي ابْتِدَاعِ مِنْ خَلَفْ (تمام خیر سلف کی اتباع میں ہے، اور تمام برائی بعد میں آنے والوں کی ایجاد کردہ باتوں میں ہے)۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ وضاحت فرمائیں۔ (حافظ سید اقبال احمد عمری، چنئی، تامل ناڈو)۔

اس کے جواب میں یہاں ایک حدیث رسول، اور خود ائمہ سلف میں سے ایک امام کا قول نقل کیا جاتا ہے۔ حدیث رسول یہ ہے: تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ، لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللَّهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِ (موطا امام مالک، حدیث نمبر 2618)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں، تم ہر گز گمراہ نہیں ہوگے جب تک تم اس کو پکڑے رہو، وہ ہے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔

اسی کے مثل امام احمد بن حنبل (وفات: 241ھ) نے مسئلۂ خلقِ قرآن کے تعلق سے خلیفۃ معتصم باللہ (وفات: 227ھ) سے کہا تھا: يا أمير المؤمنين، أعطوني شيئًا من كتاب الله أو سنّة رسول الله حتّى أقول به (تاریخ الاسلام للذہبی، بیروت، 1993، 18/103)۔ یعنی اے امیر المومنین، آپ مجھے کوئی ایسی چیز لاکر دیجیے جو کتاب اللہ یا سنت رسول میں ہو، تاکہ میں اس کو مان لوں۔

حدیثِ رسول اور امام احمد کے بیان کردہ اصول کی روشنی میں سلفی حضرات کے مذکورہ قول کو دیکھنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قول کو اگر معتدل معنی میں لیا جائے تو وہ صرف یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے عمل یا نظریہ کا انتخاب کرتے ہوئے، دوسرے علما سے استفادہ کرے۔ اس قول کو اس معنی میں لیا جائے تو اس میں کوئی قباحت پیدا نہیں ہوگی، لیکن اگر اس کو غلو تک پہنچا دیا جائے، تو پھر اس میں قباحت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر قول میں ایک سچائی کا عنصر ہوتا ہے۔ اس عنصر کو ملحوظ رکھتے ہوئے، جب اس پر عمل کیا جائے، تو وہ اعتدال کا معاملہ رہتا ہے، لیکن جب اس کو منطقی حد (logical end) تک پہنچا دیا جائے، تو اس میں مشکلات کا آغاز ہو جائے گا۔

مثلاً اگر ایک عالم کہتا ہے کہ وضو کے وقت تمام اعضا کو ٹھیک سے دھونا چاہیے۔ سادہ مفہوم کے لحاظ سے یہ قول بالکل درست قول ہے۔ لیکن اگر اس کو منطقی حد تک پہنچایا جائے، اور یہ کہا جائے کہ ہر بال کی جڑ تک پانی کو پہنچانا ضروری ہے، یا آنکھ کے اندرونی حصے کو دھونا ضروری ہے، تو یہ غلو کا معاملہ ہوگا، اور دین کے نام پر شدت تک پہنچ جائے گا، جو دین میں مطلوب نہیں — دین میں اعتدال مطلوب ہے، اور غلو غیر مطلوب۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قرآن کے مطابق، ہمارا دشمن صرف شیطان ہے جس کو قرآن میں طاغوت کہا گیا ہے۔ ہماری لڑائی صرف شیطان سے ہے، کسی اور سے نہیں۔ انسان کے اندر امتحان کے مقصد سے مختلف قسم کے جذبات رکھے گئے ہیں۔ مثلاً غصہ اور انتقام، وغیرہ۔ اِن جذبات کو غلط رُخ دے کر شیطان ہم کو صحیح راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وہ مواقع ہیں جب کہ ہمیں شیطان سے لڑنا ہے۔ شیطان کی تزئین (الحجر، 15:39) سے بچنے ہی کا نام تزکیہ ہے اور جو لوگ اِس اعتبار سے اپنا تزکیہ کریں، وہی وہ لوگ ہیں جن کو جنت میں داخلہ ملے گا (طٰہٰ، 20:76) شیطان کے خلاف انسان کی لڑائی صرف نفسیات کی سطح پر ہوتی ہے، تشدّد اور ہتھیار کی سطح پر نہیں۔ جہاں تک انسان کا معاملہ ہے، قرآن کے مطابق، انسان ہمارا مدعو ہے۔ وہ ہمارا حریف یا دشمن نہیں۔ انسان کے ساتھ ہمارا تعلق داعی اور مدعو کا ہے، دشمن یا مدِّمقابل کا نہیں۔ انسان کے مقابلے میں ہماری ذمے داری یہ ہے کہ ہم اُس کو پر امن طور پر خدا کا پیغام پہنچائیں۔ پیغام رسانی کا یہ کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو نفرت اور عداوت کے جذبات سے مکمل طور پر خالی ہوں۔ نفرت اور دعوت دونوں ایک سینے کے اندر جمع نہیں ہو سکتے۔

رسوخ فی العلم

قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے: وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری۔ اس میں بعض آیتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں فتنہ کی تلاش میں اور اس کے مطلب کی تلاش میں۔ حالاں کہ ان کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ راسخ علم والے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (آل عمران، 2:7)۔

اس آیت میں متشابہ کا مطلب مشتبہ نہیں ہے۔ بلکہ متشابہات کا مطلب متماثلات ہے۔ یعنی کچھ آیتیں جو امورِ غیب سے تعلق رکھتی ہیں، وہ فطری طور پر تمثیل کی زبان میں ہیں۔ جو لوگ زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں، وہ اس حقیقت کو جان لیتے ہیں کہ اس قسم کی آیتیں تمثیل (symbolism) کی زبان میں ہیں۔ انھیں ان آیتوں کے بارے میں شبہ واقع نہیں ہوتا۔ وہ جس طرح محکم آیتوں کا مفہوم غیر مشتبہ طور پر سمجھ لیتے ہیں، اسی طرح ان آیتوں کا مفہوم بھی سمجھ لیتے ہیں، جو تمثیل کی زبان میں آئی ہیں۔

رسوخ کا لفظ یہاں نتیجہ کے اعتبار سے ہے، نہ کہ طریقہ کے اعتبار سے۔ یعنی یہ کہ زیادہ مطالعہ اور گہرے غور وفکر کی بنا پر ایک شخص شبہات سے بلند ہوجائے۔ وہ کنفیوزن (confusion) میں نہ رہے، بلکہ فکری وضوح (intellectual clarity) کا درجہ پالے— اسی کا نام رسوخ فی العلم ہے۔ رسوخ فی العلم کوئی پیدائشی صفت نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص جس کو اپنے حالات کے اعتبار سے یہ موقع ملے کہ وہ موضوع کا گہرا مطالعہ کرے، وہ زیادہ غور وفکر کے ساتھ بات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ایسا آدمی کنفیوزن سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ وہ یقین کے درجے میں وضوح (clarity) کے ساتھ مذکورہ بات کو سمجھنے کے قابل ہوجاتا ہے۔

ایک نصیحت

ہر انسان کو پہلا کام یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دریافت (discover) کرے۔ یہ کسی آدمی کے لیے اس کی زندگی کی ابتدا ہے۔ اگر آپ سیلف ڈسکوری کے بغیر اپنی زندگی میں کوئی چوائس لے لیں۔ تو ایسے چوائس کے لیے مقدر ہے کہ وہ آپ کو غیر مطلوب انجام کی طرف لے جائے۔ اس منفی ریزلٹ کے بعد آپ چاہیں گے کہ آپ سیکنڈ چوائس لیں۔ لیکن سیکنڈ چوائس آپ کو دوسری ناکامی کی طرف لے جاسکتی ہے۔ اس سے بچنے کا صرف ایک راستہ ہے۔ وہ ہے کہ آپ ریلسٹک اپروچ کو اختیار کریں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آئڈیلزم ہمیشہ ناکامی کی طرف لے جاتا ہے، جب کہ پریگمیٹک اپروچ کامیابی کی طرف۔ لیکن یہ آئیڈیل ٹرم میں نہیں ہوتا، بلکہ یہ پریگمیٹزم کے سنس میں ہوتا ہے۔

جب آپ کوئی کام شروع کریں اور اس میں آپ کامیاب نہ ہوں، تو کبھی یہ غلطی نہ کیجیے کہ اپنی ناکامی کا الزام آپ دوسروں کو دینے لگیں۔ ناکامی جب بھی ہوتی ہے، آپ کی اپنی کسی کوتاہی کی بنا پر ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنی کوتاہی کو دریافت کرلیں تو آپ کے لیے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ اپنی زندگی کی دوسری پلاننگ (replanning) زیادہ صحیح بنیادوں پر کریں، اور اس طرح پہلی بار کی ہار کو دوسری بار جیت میں تبدیل کرلیں۔

اپنی غلطی کا ذمہ دار دوسروں کا قرار دینا، ایک بے فائدہ کام ہے۔ اس کے برعکس، جب آپ اپنی ناکامی کا سبب خود اپنے اندر تلاش کریں تو یہ کوشش آپ کو اس قابل بناتی ہے کہ آپ دوسری بار اپنے کام کی زیادہ بہتر منصوبہ بندی کرکے اپنے آپ کو کامیاب بناسکیں۔ جو آدمی آپ کی ناکامی کا الزام کسی دوسرے شخص کو دے، وہ آپ کا دشمن ہے۔ ایسا آدمی آپ کو اس قابل بننے سے روکتا ہے کہ آپ اپنی غلطی کی اصلاح کریں، آئندہ اپنی غلطیوں کو دہرانے سے بچیں۔ اپنی غلطی کا الزام دوسروں کو دینا صرف وقت کا ضیاع ہے۔ بزدل آدمی اپنی غلطی کا الزام دوسروں کو دیتا ہے، اور بہادر آدمی اپنی غلطی کو مان کر اپنے آپ کو زیادہ صحیح پلاننگ کے قابل بنالیتا ہے۔

سیکھنے کا عمل

عام طور پر لوگوں کا مزاج ہے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اپنی غلطی کی صفائی پیش کرتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی نہ کوئی پہلو نکال کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ غلطی میری نہیں تھی، بلکہ دوسروں کی تھی۔ وہ غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے ہمیشہ غلطی کی توجیہہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غلطی کے اعتراف کو وہ اپنی کمزوری سمجھتے ہیں، اور غلطی کا اعتراف نہ کرنے کو اپنی بڑائی۔ غلطی کا اعتراف نہ کرنے کو سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بڑائی کو برقرار رکھا۔

مگر یہ دانش مندی کی بات نہیں۔ دانش مندی یہ ہے کہ آدمی اپنی غلطی کو جانے۔ وہ غلطی کرنے کے بعد فوراً یہ کہہ دے کہ میں غلطی پر تھا (I was wrong)۔ غلطی کو نہ ماننا گویا غلطی کے اوپر قائم رہنا ہے، اور غلطی کو مان لینا یہ ہے کہ آدمی نے غلطی کرنے کے بعد فوراً اپنی اصلاح کرلی، اور اس طرح اپنے لیے شخصیت کے ارتقا (personality development) کے پراسس کو نان اسٹاپ (non stop) طور پر جاری رکھا۔

بڑی بات یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے آپ کو بے خطا ثابت کریں۔ اگر آپ اپنے کو بے خطا ثابت کرنے میں کامیاب ہوجائیں، تو اس کا نقصان یہ ہوگا کہ آپ جہاں پہلے تھے، وہیں اب بھی باقی رہیں گے۔ اس لیے زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ آپ کے اندر اپنی غلطی کو ماننے کا مزاج ہو۔ آپ بے جھجھک یہ کہہ سکیں کہ میں غلطی پر تھا۔

اس مزاج کا فائدہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ نئی بات سیکھتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ آپ کی شخصیت کا ارتقا (personality development) بلا رکاوٹ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ غلطی نہ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ آپ جہاں کل تھے، وہیں آج بھی برقرار ہیں۔ اس کے برعکس، غلطی ماننے کا یہ فائدہ ہے کہ آپ کی ترقی کا سفر ہمیشہ جاری رہے گا۔ آپ کے اندر لرننگ (learning) کے پراسس میں کبھی جمود نہ آئے گا۔

غلطی کا اعتراف

اگر آپ اسلام کے موضوع پر ایک کتاب لکھتے ہیں۔ اس کتاب میں آپ قلم کی پوری طاقت کے ساتھ یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ سر دھڑ کی بازی لگا کر دنیا میں حکومت الٰہیہ (Islamic State) قائم کی جائے۔ بعد کو آپ پر یہ واضح ہو کہ حکومت الٰہیہ یا اسلامک اسٹیٹ قائم کرنے کا حکم سارے قرآن میں کہیں موجود نہیں ہے، یہ آپ کی ایک اختراع ہے۔ اس وقت آپ کے لیے دو آپشنس (options) ہیں۔ ایک یہ کہ آپ صاف لفظوں میں یہ کھلا اعلان کردیں کہ میں غلطی پر تھا، آپ اپنی کتاب میں تصحیح (correction) کرلیں، اور اس کے بعد دوبارہ اس قسم کی بات کہنا چھوڑ دیں۔ یہ درست طریقہ ہے۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ کو دوسری بات کا کریڈٹ مل جائے گا، یعنی توبہ کا کریڈٹ یا غلطی کے اعتراف کا کریڈٹ۔

دوسرا آپشن یہ ہے کہ آپ اپنی غلطی کا اعتراف نہ کریں۔ بلکہ غیر متعلق باتیں کرکے یہ ظاہر کریں کہ آپ نے پہلے جو کہا تھا، وہ درست تھا، وہ قرآن وسنت کے مطابق تھا، اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے بے بنیاد تاویلیں پیش کریں، تو یہ ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہے۔ آپ کا یہ طریقہ آپ کی صفائی نہیں بنے گا، بلکہ آپ کی غلطی میں اضافہ کرتا چلا جائے گا۔

غلطی کو نہ ماننا، یا گھما پھرا کر بات کرنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہے۔ مزید یہ کہ جو لوگ ایسا کریں، وہ لوگ اپنے عمل سے یہ ثابت کررہے ہیں کہ ان کا دل خوفِ خدا سے خالی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ (accountable) نہیں سمجھتے۔ ان کا گمان ہے کہ اگر وہ دنیا والوں کے سامنے اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کردیں تو آخرت میں بھی وہ بری الذمہ قرار پائیں گے۔ یہ اللہ رب العالمین کو انڈر اسٹیمٹ (underestimate) کرنا ہے۔ غلطی کا اعتراف اللہ کے یہاں قابلِ قبول ہے، لیکن مذکورہ قسم کی روش اللہ کے یہاں قابل قبول نہیں۔

اختلاف ایک مثبت ظاہرہ

ایک قول بطور حدیثِ رسول مختلف کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:
اخْتِلَافُ أُمتِي رَحْمَة (کنز العمال، حدیث نمبر 28686)۔ یعنی میری امت کا اختلاف ایک رحمت ہے۔ محدثین عام طور پر اس قول کو بے اصل (لَا أصل لَهُ) مانتے ہیں (المقاصد الحسنۃ، حدیث نمبر 39)۔ محدثانہ اصول کے مطابق یہ قول ایک بے اصل قول ہوسکتا ہے۔ لیکن قانونِ فطرت کے اعتبار سے بلاشبہ وہ ایک درست قول ہے۔

اختلاف (difference) فطرت کے قانون کے مطابق ایک مثبت ظاہرہ ہے۔ وہ کوئی غیر مطلوب ظاہرہ نہیں۔ اختلاف اگر سنجیدہ اختلاف ہو تو وہ ڈسکشن کا دروازہ کھولتا ہے۔ لوگ اس پر سنجیدہ اظہارِ رائے کرتے ہیں، جس سے زیر بحث مسئلے کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے مشہور امریکی رائٹر اور صحافی والٹر لپ مین (Walter Lippmann) نے نہایت درست طور پر کہا ہے کہ جہاں تمام لوگ یکساں طور پر سوچیں تو وہاں کوئی بھی زیادہ نہیں سوچتا:

Where all think alike, no one thinks very much

جب دو پتھر آپس میں ٹکرائیں تو اس سے ایک تیسری چیز ایمرج کرتی ہے، اور وہ چنگاری ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ جب دو دماغ کسی اختلافی موضوع پر آپس میں گفتگو کریں تو اس سے ایک تیسرا خیال وجود میں آتا ہے، جو کہ دونوں کے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ بنتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اختلاف ایک رحمت ہے۔ اختلاف کو اگر سنجیدگی کے ساتھ لیا جائے تو اس سے غور وفکر کا نیا دروازہ کھلتا ہے، معاملے کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ البتہ اس کی یہ شرط ہے کہ گفتگو کو ہار جیت کے معنی میں نہ لیا جائے، بلکہ موضوع کی تحقیق کے معنی میں لیا جائے۔ بحث کے دونوں فریق اپنی ذات کو الگ کرکے زیرِ بحث مسئلے پر تبادلۂ خیال کریں۔

نزاع کا معاملہ

یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی دو یا زیادہ آدمیوں کے درمیان کوئی نزاع ہو، تو معمولی بات پر وہ بھڑک اٹھتا ہے، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخری حدتک پہنچنے سے پہلے وہ ختم نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی نادانی ہے، جو پوری تاریخ میں ایک ہی انداز پر جاری رہی ہے، اور آج بھی جاری ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جب تک نزاع کی صورت پیدا نہ ہو، فریقین نارمل انسان نظر آتے ہیں۔ لیکن اختلاف کی صورت پیدا ہونے کے بعد اچانک دونوں فریق غیر نارمل بن جاتے ہیں۔ پھر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ نارمل انداز میں سوچیں، اور پر امن بات چیت سے نزاع کو ختم کرلیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ نزاع سے پہلے معاملہ عقل کے درمیان ہوتا ہے، لیکن نزاع شروع ہونے کے بعد عقل پس پشت چلی جاتی ہے، اور دونوں فریق ایگو کے زیرِ اثر آجاتے ہیں۔ پہلے اگر وہ نتیجہ کو سامنے رکھ کر سوچتے تھے، تو اب وہ جذبات کے زیر اثر سوچنے لگتے ہیں۔ اس معاملے میں بہترین تدبیر یہ ہے کہ معاملے کو عقل کی حد میں رکھا جائے، اس کو جذبات تک پہنچنے نہ دیا جائے۔ اس معاملے میں فارمولا یہ ہے:

When one's ego is touched, it turns into super ego, and the result is breakdown.

اگر فریقین ٹھنڈے ذہن کے ساتھ نتیجہ کو لے کر سوچیں تو ان کو سمجھ میں آجائے گا کہ نزاع جاری رکھنے کا انجام دونوں کے حق میں برا نکلے گا۔ دونوں کے حق میں صرف نقصان آئے گا۔ دونوں میں سے کسی کو بھی کوئی فائدہ ملنے والا نہیں۔ معاملے پر عقلی انداز میں سوچنا، دونوں کو ایک ہی انجام تک پہنچاتا ہے۔ وہ یہ کہ نزاع کا جاری رکھنا، کسی کے حق میں اچھا نہیں۔ جب کہ نزاع کو پہلی فرصت میں ختم کرلینا، دونوں کے لیے مفید ہے۔ نزاع کا واحد حل صرف یہ ہے کہ نزاع کو پہلی فرصت میں بلاشرط ختم کردیا جائے۔ اس حکمت کو ملحوظ رکھا جائے تو انسان بہت سے نقصانات سے بچ جائے گا۔ یہ نزاع کے مسئلے کا سب سے زیادہ آسان حل ہے۔

دعوت میں رُجز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک مین آف مشن تھے۔ آپ کی پوری زندگی مشن کی زندگی تھی۔ قرآن میں پیغمبر اسلام کو دعوت کا حکم دیتے ہوئے ایک بنیادی اصول یہ بتایا گیا: وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (74:5)۔ یعنی رجز کو چھوڑ دو۔ رجز کا لفظی مطلب گندگی (dirty practice) ہے۔ پیغمبر اسلام نے نبوت سے پہلے مکہ میں چالیس سال گزارے تھے۔ پیغمبر اسلام حنفاء میں سے تھے، انھوں نے اس پوری مدت میں کوئی غیر اخلاقی کام نہیں کیا، کبھی کسی قسم کی گندگی کے فعل یا بُری عادت میں مبتلا نہیں ہوئے۔ پھر گندگی چھوڑنے کا مطلب کیا ہے۔

اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ گندگی کو چھوڑ دو۔ یہاں رجز (گندگی) سے وہی چیز مراد لی جائے جو آپ نے عملاً اختیار فرمائی۔ وہ یہ کہ ردعمل (reaction) کا طریقہ اختیار نہ کرو۔ جب آپ نے مکہ میں اپنا مشن شروع کیا تو وہاں کے لوگوں میں شرک کی برائی عام تھی۔ ایسی حالت میں ایک عام انسان یہ کرے گا کہ وہ سماجی طور پر پھیلی برائی کے خلاف ردعمل کا طریقہ اختیار کرے گا۔ مگر آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ تم صرف مثبت طریقے پر قائم رہو، اور ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کرو۔

پیغمبر اسلام نے مکہ میں جو روش اختیار کی، وہ عمل یہی تھا۔ یعنی موجود برائی کے خلاف ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کرنا، اور امن پر قائم رہتے ہوئے مثبت انداز میں توحید کی طرف لوگوں کو بلانا۔ قرآن کی یہ آیت (وَالرُّجْزَ فَاهْجُر) اسلامی مشن کا بنیادی اصول بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ ردعمل کی روش سے کامل طور پر دور رہنا، اور کامل طور پر امن اور خیر خواہی کی روش پر قائم رہتے ہوئے لوگوں کو حق کی طرف بلانا۔

بعض مفسرین نے وَالرُّجْزَ فَاهْجُر کی شرح یہ کی ہے کہ بتوں کی گندگی سے دور رہیے، جیسے اب تک دور ہیں۔ مگر یہ ایک غیر ضروری تکلف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ رسول اللہ کے عمل کی بنیاد پر اس کی تفسیر کی جائے، اور وہ یہی ہے کہ بتوں کے معاملے میں ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کرو، بلکہ ان سے اعراض کرتے ہوئے مثبت انداز میں دعوت کا کام جاری رکھو۔

انقلاب کا آغاز

انسانی زندگی میں کسی بڑے انقلاب کا آغاز اس وقت ہوتا ہے، جب کہ انسان کے اندر کوئی بریک تھرو (breakthrough) کا واقعہ پیش آئے۔ کوئی ایسا واقعہ جو انسان کے اندر وہ نفسیاتی بھونچال پیدا کرے جس کو برین اسٹارمنگ (brainstorming) کہا جاتا ہے۔ ایسا واقعہ جو انسان کی پوری شخصیت کو ہلا دے۔

اصل یہ ہے کہ عام حالت میں انسان کے ذہن کی تمام کھڑکیاں بند رہتی ہیں۔ اس بنا پر اس کی تمام صلاحیتیں بالقوۃ حالت میں پڑی رہتی ہیں، ان کو بالفعل بنانے کے لیے ایک انقلابی حرکت درکار ہے۔ اس انقلابی حرکت کا نقطہ آغاز صرف ایک ہے، اور وہ ہے اعترافِ خطا۔ یعنی یہ کہہ سکنے کی ہمت کہ میں غلطی پر تھا:

I was wrong.

یہ اعترافِ خطا جتنا زیادہ شدید ہوگا، اتنا ہی زیادہ بڑا انقلاب آدمی کی شخصیت میں آئے گا۔ اس اعترافِ خطا کے اعلی درجہ کو قرآن میں توبہ نصوح (التحریم,66:8) کہا گیا ہے۔ کوئی انسان اس وقت تک ٹھہرا ہوا پانی ہے، جب تک اس کے اندر اعترافِ خطا کا بھونچال نہ آئے۔ اعترافِ خطا کی مثال ایسی ہے، جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں کوئی بڑا پتھر پھینک دیا جائے۔ یہ پتھر پانی کے پورے تالاب کو متحرک کر دیتا ہے۔ یہی توبہ نصوح ہے، اور توبہ نصوح کے بغیر زندگی میں وہ اعلیٰ شخصیت نہیں ابھرتی جس کو قرآن میں احسن العمل (الملک,67:2) والی شخصیت کہا گیا ہے۔ نفسیات کی زبان میں اس کو اعلیٰ درجے کی ترقی یافتہ شخصیت (highly developed personality) کہا جاسکتا ہے۔

انسان عزت نفس (self respect) کے نام پر اکثر یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کیے بغیر اعلیٰ درجے تک پہنچ جائے۔ اس کو عام طور پر لوگ عزتِ نفس کہتے ہیں۔ عزتِ نفس سے آدمی کو فرضی تسکین تو مل سکتی ہے، مگر شخصیت کے ارتقا کا پراسس جاری نہیں ہوسکتا۔

گفتگو کا اصول

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی سے کوئی گفتگو کی جائے، اور درمیان میں کوئی ایسی بات آجائے جو بظاہر صاحبِ گفتگو کے نقطۂ نظر کے خلاف ہو، تو وہ فوراً اس کے دفاع میں بولنے لگتا ہے۔ یہ طریقہ علمی گفتگو کا طریقہ نہیں۔ علمی گفتگو کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کی بات کو درمیان میں کاٹے بغیر غیر جانبدارانہ انداز میں سنیں۔ دونوں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ گفتگو کا مقصد میوچول لرننگ (mutual learning) ہو، نہ کہ دوسرے کی بات کو کاٹنا، اور اپنی بات کو صحیح ثابت کرنا۔

گفتگو کا معیار (criterion) یہ ہونا چاہیے کہ دونوں فریق نے اپنے علم میں کیا اضافہ کیا۔ دونوں فریق نے کیا نئی بات سیکھی۔ دونوں فریق نے گفتگو کے موقع کو کس طرح ذہنی ارتقا (intellectual development) کے لیے استعمال کیا۔

دو آدمیوں کے درمیان گفتگو کا مقصد مناظرہ (debate) نہیں ہوتا، بلکہ شخصیت کا ارتقا (personality development) ہوتا ہے۔ کوئی آدمی جتنا جانتا ہے، وہی جاننے کی حد نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جاننے کا سمندر بہت وسیع ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ہر گفتگو کو اس مقصد کے لیے استعمال کرے، جس سے اس کے علم میں اور اضافہ ہو، اس کی تخلیقی فکر (creative thinking) اور زیادہ ہو جائے۔

اس کے تجربات کی فہرست میں نئے آئٹم شامل ہوں۔ زندگی کی منصوبہ بندی (planning) کے لیے اس کا دائرہ (vista) اور وسیع ہو جائے۔ اس کے اندر ایک نئی شخصیت ایمرج (emerge) کرے۔ وہ پہلے سے زیادہ پختہ انسان (mature person) بن کر ابھرے۔ وہ اپنے بارے میں اور دوسرے کے بارے میں زیادہ واقفیت حاصل کرے۔ وہ ماضی اور حال کے بارے میں زیادہ جاننے والا بن جائے۔

حکمت کی تعلیم

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کا رسول انسانوں کو اللہ کی کتاب دیتا ہے، جس میں اللہ کے قوانین درج ہیں، اور اسی کے ساتھ وہ انسان کو حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ حکمت کی تعلیم سے کیا چیز مراد ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم پر عمل کرنا، کوئی سادہ بات نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ دنیا ایک میدان ہے، اور اس میں ہر انسان آزاد ہے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہے، بلا روک ٹوک اپنی مرضی کے مطابق انجام دے سکے۔ بلکہ صورت حال یہ ہے کہ دنیا میں دوسرے بہت سے انسان آباد ہیں۔ ہر ایک کے اپنے منصوبے ہیں، ہر ایک کا اپنا الگ الگ ایجنڈا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے اپنا منصوبہ بنائے۔ اگر لوگ ایسا نہ کریں تو سارے لوگ آپس میں لڑیں گے، اور کوئی بھی شخص اپنا کام درست طور پر انجام نہ دے سکے گا۔

ایسی حالت میں انسان کو اپنا کام انجام دینے کے لیے دانش مندانہ منصوبہ بنانا پڑتا ہے۔ اس دانش مندانہ منصوبے کو ایک لفظ میں پریکٹکل وزڈم کہا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کی ان آیات میں حکمت سے مراد عملی دانش مندی (practical wisdom) ہے۔ یعنی دوسروں سے ٹکراؤ کیے بغیر اپنے منصوبے کو مکمل کرنا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مکہ میں جب آپ نے توحید کا مشن شروع کیا تو وہاں کی اکثر آبادی شرک پر قائم تھی۔ رسول اللہ کو یہ کرنا تھا کہ مشرکین سے ٹکراؤ کیے بغیر اپنا توحید کا منصوبہ پر امن انداز میں عمل میں لائیں۔ توحید کا اصول ایک مطلق اصول ہے۔ اس کے مقابلے میں توحید کو زیر عمل لانا، دانش مندانہ منصوبے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹکراؤ کیے بغیر توحید کے منصوبے کو زیر عمل لانے کے لیے اس حکمت کو اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جس کو پریکٹکل وزڈم کہا جاتا ہے۔ پیغمبر یہ کرتا ہے کہ وہ ایک طرف توحید کے اصول لوگوں کو بتاتا ہے، اور دوسری طرف وہ پریکٹکل وزڈم یعنی اس کے اختیار کرنے کے عملی پہلوؤں سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے تاکہ وہ کوئی نیا

مسئلہ کھڑا کیے بغیر توحید کے عامل بن سکیں۔

غور وتدبر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں رسول کی نسبت سے جس چیز کو حکمت کہا گیا ہے۔ اس سے مراد یہی پریکٹکل وزڈم ہے۔ پیغمبر نے اپنی پوری زندگی میں اس پریکٹکل وزڈم کو اختیار کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو رسول اور اصحابِ رسول لڑائی اور ٹکراؤ کی تاریخ بناتے، نہ کہ توحید کی اشاعت کی تاریخ۔

مثال کے طور پر رسول اللہ نے مکہ میں توحید کا پیغام دینا شروع کیا تو آپ نے کعبہ سے اس کا آغاز کیا۔ اس وقت کعبہ میں سینکڑوں کی تعداد میں مشرکین نے اپنے بت رکھ دیے تھے۔ اگر آپ اپنے مشن کا آغاز بتوں کو کعبہ سے نکالنے سے شروع کرتے تو یقینا آپ کا مشرکین کے ساتھ ٹکراؤ شروع ہوجاتا، اور کوئی مثبت کام انجام نہ پاتا۔ اسی طرح ہجرت کے وقت ایسا نہ ہوتا کہ آپ پر امن طور پر مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے جاتے اور نہ ہی مدینہ میں اپنے مشن کی ری پلاننگ کرتے۔ اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر ایسا نہ ہوتا کہ آپ کے اور مشرکین کے درمیان ناجنگ معاہدہ تشکیل پاتا، بلکہ دونوں فریق حدیبیہ کو جنگ کا میدان بنالیتے، وغیرہ۔

پیغمبر کی نسبت سے حکمت کا لفظ سمجھنے کے لیے ہم کو یہ طریقہ اختیار کرنا پڑے گا کہ پیغمبر نے عملاً اس حکمت کو مکہ اور مدینہ میں کس طرح اختیار کیا۔ اس معاملے میں رسول اللہ کا عملی نمونہ بتائے گا کہ وہ چیز کیا تھی، جس کو قرآن میں آپ کی نسبت سے حکمت کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس آیت کی تفسیر یہ بنتی ہے کہ الکتاب، رسول اللہ کی تعلیمات کو جاننے کا نظری ماخذ ہے، اور توحید کے مشن کو عرب میں جاری کرنے کے لیے آپ نے جو طریقہ کار اختیار فرمایا، وہ آپ کا عمل ہے، جس کو قرآن میں حکمت کہا گیا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ الکتاب سے مراد اسلام کی نظری تعلیم ہے، اور حکمت سے مراد اس کا عملی پہلو ہے۔ دوسرے لفظ میں حکمت سے مراد وہی چیز ہے، جس کو پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کہا جاتا ہے۔ یعنی نظری تعلیم کو عمل کی صورت میں ڈھالنا۔

سمجھدار انسان

سقراط (Socrates) 399 قبل مسیح کا مشہور یونانی فلسفی ہے۔ اس کی زبان یونانی زبان تھی۔ اس کے ایک قول کا عربی زبان میں اس طرح ترجمہ کیا گیا ہے: الإنسان الذکي يتعلم من كل شيء ومن كل أحد۔ یعنی سمجھدار انسان ہر چیز سے، اور ہر ایک سے سیکھتا ہے۔

سمجھدار (ذکی) انسان وہ ہے جو ذہنی اعتبار سے ایک تیار ذہن (prepared mind) ہو۔ جو ذہنی ارتقا کے مراحل کو طے کر چکا ہو۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی اخذ (grasp) کی طاقت بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ باتوں کو سنتے ہی اس کے گہرے مفہوم تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ ظاہری معنی سے گزر کر بات کے گہرے پہلوؤں کو دریافت کرلیتا ہے۔

کوئی آدمی سمجھدار کیسے بن سکتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ آدمی اپنی کمیوں کو دریافت کرنے کا زیادہ سے زیادہ شائق بن جائے۔ اپنی کمیوں کو دریافت کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر تعلم (learning) کی صفت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ آدمی کے اندر تواضع (modesty) کی صفت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ کسی نفسیاتی رکاوٹ کے بغیر دوسروں سے سیکھنے لگتا ہے۔ کسی قسم کی بڑائی کا جذبہ اس کے لیے ذہنی ترقی میں رکاوٹ نہیں رہتا۔ وہ اتنا زیادہ متلاشی (seeker) بن جاتا ہے کہ جب بھی کوئی وزڈم کی بات اس کے سامنے آتی ہے، تو وہ کسی رکاوٹ کے بغیر فوراً اس کو قبول کرلیتا ہے۔

نفسیاتی رکاوٹ یہ ہے کہ آدمی کے اندر یہ ذہن بن جائے کہ وہ جانتا ہے۔ یہ ذہن مزید سیکھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دانش مند انسان وہ ہے، جو اپنے ''نہیں'' کو جانے۔ جو آدمی ''نہیں'' کو جانے گا، وہ گویا پیشگی طور پر وزڈم کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ ایسا آدمی ہر ایک سے سیکھے گا، ایسا آدمی ہر تجربے کو پکڑے گا، ایسا آدمی ''میں جانتا ہوں'' کی نفسیات سے پاک ہوگا۔ اس لیے وہ ہر وقت جاننے اور سیکھنے کے لیے تیار رہے گا۔

تجربہ سے سبق سیکھیے

تجربہ (experience) ہمیشہ سبق کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں، جو اپنے تجربے کو سبق بناسکیں۔ تجربہ ہر انسان کی زندگی کا ایک سبق آموز واقعہ ہوتا ہے۔ تجربہ انسان کے لیے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ ہے۔ لیکن عام طور پر لوگ تجربہ سے مثبت فائدہ حاصل نہیں کر پاتے۔ اس لیے کہ وہ تجربہ کو شکایت کے خانے میں ڈال دیتے ہیں۔

یہ فطرت کا قانون ہے کہ جب بھی کسی کے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آتا ہے تو وہ صرف دوسرے کی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتا۔ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ایسے کسی واقعے میں دونوں فریق کا حصہ ہوتا ہے، کسی کا کم کسی کا زیادہ۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ جب کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آتا ہے تو وہ اس کو یک طرفہ طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی غلطی کو حذف کر کے سارے معاملے کو دوسرے کی غلطی کے خانے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہی تقریباً ننانوے فیصد مثالوں (cases) میں پیش آتا ہے۔

مگر اس طرح یک طرفہ رائے قائم کرنا، قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اصحابِ رسول جیسے سارے لوگ ہوں، تب بھی ناخوش گوار واقعات میں کچھ نہ کچھ اپنا حصہ شامل رہتا ہے۔ اس کی ایک مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں غزوہ احد کا واقعہ ہے۔ اس غزوہ میں اصحاب رسول کو ابتداءاً کامیابی ہوئی، لیکن بعد کو خود اپنی ایک غلطی سے سخت نقصان اٹھانا پڑا (آل عمران:152-153)۔

تجربے کو سبق (lesson) بنائیے، تجربے کو شکایت (complaint) نہ بنائیے۔ تجربے کو سبق بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی کے ایک منفی واقعہ کو مثبت واقعہ میں تبدیل کردیا، آدمی نے اپنے نقصان کو دوبارہ اپنے لیے فائدہ بنالیا۔ اس کے برعکس، جو لوگ تجربے کو شکایت اور نفرت کا ذریعہ بنالیں، انھوں نے گویا نقصان کے بعد ملنے والے فائدہ سے بھی اپنے کو محروم کرلیا۔ انھوں نے پہلے موقع کو بھی کھویا، اور دوسرے موقع کو بھی کھودیا۔

مثبت سوچ کی ضرورت

مثبت سوچ (positive thinking) کا مطلب کیا ہے۔اس سے مراد وہ سوچ ہے جو ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہو۔جس میں شکایت اور احتجاج کے بجائے ،مکمل طور پر حقیقت واقعہ کی بنا پر رائے قائم کی جائے۔ مثبت سوچ وہ ہے جو ہر قسم کے فخر اور تعصب سے خالی ہو۔ مثبت سوچ دوسرے الفاظ میں مبنی بر حقیقت سوچ کا نام ہے۔

مثبت سوچ کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ منفی سوچ سے منفی شخصیت بنتی ہے، اور مثبت سوچ سے مثبت شخصیت۔ مثبت سوچ فطرت کی آواز ہوتی ہے، اور منفی سوچ ابلیس کی آواز۔ مثبت سوچ انسان کو پاکیزہ شخصیت بناتی ہے، اور منفی سوچ اس کی شخصیت کو آلودہ شخصیت بنا دیتی ہے۔ مثبت سوچ والے آدمی کو جنت میں بسانے کے لیے منتخب کیا جائے گا، اور منفی سوچ والا آدمی ہمیشہ کے لیے جنت میں داخلہ سے محروم رہے گا۔

منفی سوچ سے بچنا، اور مثبت سوچ کا طریقہ اختیار کرنا، اتفاق سے نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت آدمی کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کہ وہ اس معاملہ میں بہت زیادہ باشعور ہو، جب وہ شعوری طور پر اپنے آپ کو ایسا بنانے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی برابر اپنا محاسبہ کرتا رہے۔

مثبت سوچ کا معاملہ، مثبت سوچ برائے مثبت سوچ نہیں ہے۔ یعنی مثبت سوچ بذاتِ خود اصل مقصود نہیں ہے، بلکہ مثبت سوچ کا فائدہ یہ ہے کہ مثبت سوچ والا آدمی ہر قسم کے ڈسٹریکشن سے بچ جاتا ہے۔ اس کا ذہن اس مقصد کے لیے خالی ہو جاتا ہے کہ وہ صرف ضروری باتوں میں اپنے ذہن کو مشغول کرے، وہ غیر ضروری باتوں میں اپنے وقت کو ضائع نہ کرے۔ مثبت سوچ آدمی کو بامقصد انسان بناتی ہے۔ مثبت سوچ آدمی کو ایسی مصروفیت سے بچاتی ہے جس کا کوئی فائدہ، نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں۔

ٹیک اوے کیا ہے

ایک بار میں لندن کی ایک سڑک پر چل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک دکان کے سامنے ایک بورڈ لگا ہوا ہے، اس بورڈ پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا، ٹیک اوے (takeaway)۔ ٹیک اوے کا لفظی مطلب ہے، لے کر جانا۔ پہلے یہ لفظ دکان کے لیے بولا جاتا تھا کہ آپ دکان پر جائیں، اور آپ وہاں اپنا مطلوب سامان مثلاً کھانے کا پیکٹ قیمت ادا کر کے لیں اور چلے جائیں۔ بعد کو یہ لفظ عام ہو کر اِس مفہوم میں بولا جانے لگا کہ آپ کسی میٹنگ میں شرکت کریں، اور وہاں سے آپ کوئی آئڈیا یا نئی بات لے کر واپس آئیں:

A key fact, point, or idea to be remembered, typically one emerging from a discussion or meeting.

کوئی تقریر یا تحریر کامیاب تقریر یا تحریر اس وقت ہے، جب ایسا ہو کہ آپ اس تحریر کو پڑھیں یا کسی اجتماع میں اس تقریر کو سنیں، اور اس سے آپ کو کوئی کام کی بات یا کوئی مفید آئڈیا ملے، اور اس کو لے کر آپ واپس جائیں۔ تقریر یا تحریر کی کامیابی کا یہی معیار ہے۔ اگر اس کے برعکس معاملہ ہو، یعنی جس تقریر یا تحریر سے کوئی ایسی بات نہ ملے جو لے جانے کے قابل ہو، تو آپ نے اپنا وقت ضائع کیا۔ آپ کا پڑھنا بھی بے فائدہ تھا، اور سننا بھی بے فائدہ۔

مقرر ہو یا محرر، دونوں کو چاہیے کہ وہ بولنے یا لکھنے سے پہلے اچھی طرح سوچے، اور کوئی ایسی بات متعین کرے، جو دوسروں کو دینے کے قابل ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ بات آپ واضح انداز میں بیان کرسکیں۔ اگر ایسا ہو کہ آپ نے لکھا یا کہا تو اس سے پڑھنے یا سننے والے کو کوئی لے جانے کی بات نہیں ملی تو ایسا لکھنا بھی بیکار رہے، اور پڑھنا بھی بیکار رہے۔

کسی تقریر یا تحریر کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ اس میں پڑھنے یا سننے والے کے لیے حقیقی معنی میں کوئی ٹیک اوے ہو۔ پڑھنے یا سننے والے کو کوئی ایسی بات ملے، جس کے ذریعے وہ اپنی زندگی کو زیادہ مفید بنا سکے، جو اس کے شخصی ارتقا میں مددگار ثابت ہو۔

رب العالمین کا شکر

اس دنیا میں انسان کے لیے بقدرضرورت چیزیں رکھی گئی ہیں، نہ کہ بقدر اشتہا، تو انسان اس دنیا میں کس طرح خدا کا شکر گزار بن سکتا ہے۔ (مولانا عبدالباسط عمری، قطر)

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موجودہ حالت میں انسان صرف بقدرضرورت چیزوں کا تحمل کرسکتا ہے۔ بقدر اشتہا چیزوں کا تحمل انسان کے لیے موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے بقدر اشتہا کا طالب ہونا، ایک غیر فطری بات ہے۔ وہ انسان کی فطرت کا حقیقی تقاضا نہیں۔

اس حقیقت کا اعتراف موجودہ دنیا کے اپنے وقت کے سب سے زیادہ امیر آدمی امریکا کے مسٹر بل گیٹس (پیدائش 1955) نے کیا ہے۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا— اگر تم ایک ملین ڈالر سے زیادہ حاصل کرلو، تب بھی تمھاری ضرورت ایک ہمبر گر ہی رہے گی۔

Once you get beyond a million dollars, it's still the same hamburger.

اس معاملے میں شکر گزاری یہ ہے کہ آپ اللہ کی اس رحمت کا اعتراف کریں کہ انسان کی جو حقیقی ضرورت تھی، وہ اللہ نے انسان کو عطا کیا۔ اگر اللہ ایسا کرتا کہ انسان کو اس کی حقیقی ضرورت سے زائد دیتا تو ایسی حالت میں انسان کے اندر فساد پیدا ہوتا، نہ کہ شکر۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے انسان کو اس کی فطرت کے مطابق دیا، نہ کہ اس کی خواہش کے مطابق۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کی اس حکمت کو دریافت کرے، اور اس صورتِ حال کو شکر کا مسئلہ بنائے، نہ کہ شکایت کا مسئلہ۔

بل گیٹس کی مثال بتاتی ہے کہ اس کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت آئی، تو اس نے پایا کہ اس کے بچے بگاڑ میں مبتلا ہوگئے۔ اس بنا پر بل گیٹس نے اپنی دولت کا بڑا حصہ چیریٹی میں دے دیا، کیوں کہ اس نے دیکھا کہ ضرورت کے بقدر دولت انسان کو اپنی حد پر رکھتی ہے۔ اس کے برعکس، اگر انسان کو ضرورت سے زیادہ دولت مل جائے، تو وہ بگاڑ کا شکار ہوجاتا ہے۔

سبق کا پہلو

راقم الحروف کا ایک آرٹیکل نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا، 16 مارچ 2018 میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان ہے :

The Hawking Effect: Triumph of Human Spirit

یہ آرٹیکل برٹش سائنس داں اسٹیفن ہاکنگ کے بارے میں ہے، جس کی وفات 14 مارچ 2018 کو 76 سال کی عمر میں ہوگئی۔ اس مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک عرب عالم نے کہا: هل يناسب هذا الكلام عن احد اكبر دعاة الالحاد و محاربة الله فی هذا العصر۔ یعنی کیا اس طرح کا کلام اس آدمی کے بارے میں مناسب ہے جو موجودہ زمانے میں الحاد کا ایک بڑا داعی اور خدا کے وجود کا مخالف ہے۔

میرے آرٹیکل کے بارے میں یہ تبصرہ ایک غیر واقعی تبصرہ ہے۔ راقم الحروف کا یہ مضمون انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ کوئی بھی شخص مذکورہ عنوان کے تحت اس آرٹیکل کو پڑھ سکتا ہے۔ اس آرٹیکل کا کوئی تعلق اسٹیفن ہاکنگ کے ذاتی مدح یا ذم سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کی زندگی کے ایک پہلو کو سادہ طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس پہلو میں دو قسم کے سبق موجود ہیں۔ ایک یہ کہ اس دنیا میں یہ ممکن ہے کہ معذور شخص بھی ایک بڑا کام کرسکے، اور دوسرا یہ کہ کائنات میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس لیے کائنات میں واحد کنٹرول کا نظام ہونا چاہیے۔ اسٹیفن ہاکنگ نے اس پر کام کیا ہے، جس کو سنگل اسٹرنگ تھیَری کے نام سے جانا جاتا ہے، سنگل اسٹرنگ تھیَری باعتبار حقیقت توحید کی سائنسی تصدیق کے ہم معنی ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سبق کے لیے کسی بھی چیز کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ جہاں سبق کا پہلو ہو، وہاں بات کو مطلوب سبق (lesson) کے اعتبار سے دیکھا جائے گا، بات کا دوسرا پہلو وہاں حذف ہوجائے گا۔ اس اصول کو قرآن (البقرۃ، 2:26) کے مطالعے سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

اختلافِ رائے

مغرب کے سفر میں میری ملاقات ایک بڑے مغربی اسکالر سے ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مغرب (West) کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا— اختلافِ رائے کو انسان کا ناقابل تنسیخ حق سمجھنا:

To accept dissent as an absolute human right.

مغربی اسکالر کے اس جواب کو سننے کے بعد میں نے اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً:

- Dissent: The History of an American Idea, by Ralph Young
- On Liberty, by John Stuart Mill
- The Constitution of Liberty, by F. A. Hayek

اس موضوع پر اپنے مطالعے کے نتیجے میں میں اس رائے کی صداقت پر مطمئن ہوگیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی تہذیب سے پہلے انسانی تاریخ میں اختلاف رائے کو انسانی حق (human right) کا درجہ حاصل نہ تھا۔ یہ صرف مغربی تہذیب کے بعد ہوا ہے کہ اختلاف رائے کو متفقہ طور پر ایک یونیورسل نارم کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

اختلاف رائے کو ڈیسنٹ (dissent) کا نام دینا مغربی تہذیب کا ظاہرہ ہے۔ مغربی تہذیب سے پہلے یہ لفظ موجود نہ تھا۔ ڈیسنٹ ایک نیوٹرل لفظ ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ مثبت اختلاف کے لیے یہ ایک صحیح ترین لفظ ہے۔ مثبت اختلاف صرف اختلاف ہوتا ہے، وہ نہ موافق ہوتا ہے، اور نہ مخالف۔ میں سمجھتا ہوں کہ مثبت اختلاف اجتماعی ترقی کے لیے شرط لازم ہے۔

اختلاف اگر صرف اختلاف ہو تو وہ نہایت آسانی سے مخالفت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور مخالفت صرف ایک منفی سرگرمی ہے۔ مخالفت کو مثبت سرگرمی بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو مثبت معنی دے دیا جائے۔ یعنی اختلاف کو ڈیسنٹ کا معنی قرار دینا۔ مثبت اختلافِ طرفین کے لیے

ذہنی ارتقا کا ذریعہ ہے، جب کہ منفی اختلاف کا دونوں میں سے کسی کے لیے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

میں ذاتی طور پر اختلاف رائے کو یہی درجہ دیتا ہوں۔ میں نے اپنے ذاتی تجربے سے یہ سمجھا ہے کہ اختلافِ رائے کو نہ ماننا خود اپنے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ اس لیے کہ اختلاف رائے کے ذریعہ زیرِ بحث مسئلے کے مختلف پہلو کھلتے ہیں۔ اس کے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کسی انسان کے لیے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جو آدمی اختلاف رائے کو برداشت نہ کرے، وہ یقینی طور پر ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہو گیا، اور وہ نعمت ہے ذہنی ارتقا۔

کسی نے درست طور پر کہا ہے: من هو ناصحك، خير لك ممن هو مادحك (جو شخص تمھیں نصیحت کرے، وہ اس سے بہتر ہے جو تمھاری تعریف کرے)۔ جو آدمی حقیقت پسند ہو، وہ یقیناً تنقید یا اختلاف رائے کو اپنے لیے ایک نعمت سمجھے گا۔ کیوں کہ تنقید اور اختلاف رائے ہمیشہ فکر کے نئے دروازے کھولنے والا ہے۔

تنقید یا اختلاف رائے کو کھلے ذہن کے ساتھ سننا میرے نزدیک کوئی تقویٰ کی بات نہیں ہے، بلکہ وہ خالص علمی بات ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کے اندر سائنٹفک ٹمپر (scientific temper) موجود ہے۔ سائنٹفک ٹمپر اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی کے اندر اعترافِ حقیقت (acceptance of reality) کا مزاج ہو۔ جب آپ اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ آپ آزادانہ سوچیں، اور آزادانہ رائے قائم کریں تو فطرت کے قانون کے مطابق آپ کو یہ بھی ماننا چاہیے کہ دوسرے شخص کو بھی یکساں طور پر اپنی رائے رکھنے اور اس کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اختلاف رائے کو کھلے ذہن کے ساتھ سننا، گویا حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرنا ہے۔ اسی اعتراف کا دوسرا نام سائنٹفک اسپرٹ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اس دنیا میں صرف دو چیزیں ہیں جو آدمی کو متواضع بناتی ہیں۔ ایک، سائنٹفک ذہن، دوسرے متقیانہ مزاج۔ سائنٹفک ذہن علم کی معرفت سے بنتا ہے اور متقیانہ ذہن خدا کی معرفت سے۔

تسفیہ یا تنقید

ایک مضمون نگار نے ہندستانی مسلمانوں پر ایک مقالہ شائع کیا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: اس سے زیادہ بے عقلی کی کوئی بات نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ (انڈیا میں) ''مسلمان ترقی کررہے ہیں''۔ ایسی بات اسی شخص کی زبان سے نکل سکتی ہے جو ذہنی اور فکری طور پر مفلس ہوگیا ہو یا غباوت کی بلند ترین چوٹی پر ہو (جولائی-اگست 2016)۔ اس پیرا گراف میں جو جملے ہیں، وہ باعتبار گرامر درست ہیں۔ لیکن اپنے معنی کے اعتبار سے وہ درست نہیں کہے جاسکتے۔

حقیقت کے اعتبار سے دیکھیے تو ترقی عطیے کی چیز نہیں۔ وہ ایک خود حاصل کردہ چیز کا نام ہے۔ اس دنیا میں ہر قسم کے مواقع پھیلے ہوئے ہیں۔ جو فرد یا گروہ ان مواقع کو پہچانے، اور ان کو درست طور پر استعمال کرے، وہ ترقی کرے گا، اور جو فرد یا گروہ ان مواقع کو نہ پہچانے، اور درست منصوبہ کے ذریعہ ان کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے، وہ ترقی سے محروم رہے گا۔

فطرت کے قانون کے مطابق، اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ جیسا بونا ویسا کاٹنا۔ اصل یہ ہے کہ ترقی کرنا، انسان کا اپنا کام ہے۔ دوسرا انسان اس کو نہ تو ترقی دے سکتا، اور نہ ترقی سے محروم کرسکتا۔ موجودہ زمانے میں ایک نیا دور آیا ہے، اس کو ترقی کا انفجار کہا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں ترقی کے مواقع اتنے زیادہ کھل چکے ہیں کہ کوئی شخص ترقی سے محروم نہیں رہ سکتا، الا یہ کہ وہ ترقی کرنا نہ چاہتا ہو۔ موجودہ زمانہ ایک مختلف زمانہ ہے۔ اس زمانے میں اجارہ داری (monopoly) کا تصور ختم ہوچکا ہے۔ اب آزادی کا دور ہے، نہ کہ اجارہ داری کا دور۔

ایک دن ایک صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آئے، وہ میرے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ میں ان سے پوچھا کہ دہلی میں کیسے آنا ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میرا پوتا انگلینڈ جا رہا ہے، اس کو پہنچانے کے لیے آیا ہوں۔ اس طرح کے تجربے مجھے بار بار ہوتے رہتے ہیں۔ ایک آدمی جس کے پاس پہلے کوئی روزگار نہیں تھا۔ اب وہ روزگار کے نئے طریقوں کو حاصل کرکے ترقی کررہا ہے، وغیرہ۔

تنقید کا طریقہ

تنقید اگر ثابت شدہ مثال کے ساتھ ہو، تو وہ علمی تنقید ہے۔ اس کے برعکس، اگر تنقید ثابت شدہ مثال کے بغیر ہو، تو وہ ایک الزام (allegation) ہے۔ علمی تنقید ایک جائز فعل ہے۔ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ کسی شخص کے اوپر ایک بااصول تنقید کرے۔ لیکن ثابت شدہ مثال کے بغیر کسی کے اوپر تنقید کرنا، تنقیص ہے، جو کہ ایک ناقابلِ قبول فعل ہے۔ اس قسم کی تنقید کا فائدہ نہ ناقد کو ملتا ہے، اور نہ زیرِ تنقید شخص کو۔

جائز تنقید ایک صحت مند علمی سرگرمی ہے۔ صحت مند تنقید وہ ہے، جو ثابت شدہ مثال کی بنیاد پر کی گئی ہو۔ ایسی تنقید ہر اعتبار سے مفید ہے۔ اس کے برعکس، غیر صحت مند تنقید جس میں کسی ثابت شدہ مثال کا حوالہ موجود نہ ہو، وہ ایک علمی فساد ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مثلاً اگر آپ یہ کہیں کہ فلاں شخص کا کوئی کنٹری بیوشن علم کی دنیا میں نہیں ہے۔ تو یہ تنقید صرف اس وقت درست قرار پائے گی، جب کہ اس میں ثابت شدہ مثال کا حوالہ دیا گیا ہو۔ ثابت شدہ مثال کے بغیر کی ہوئی تنقید بے بنیاد الزام (false allegation) کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایسی تنقید مفسدانہ علمی سرگرمی کے برابر ہے۔ لیکن اگر اس میں ثابت شدہ مثال دی گئی ہو، تو بلاشبہ وہ ایک صحت مند علمی سرگرمی ہے، اور صحت مند علمی سرگرمی نہایت ضروری ہے۔ صحت مند علمی سرگرمی لوگوں کو ذہنی جمود (intellectual stagnation) سے بچاتی ہے۔

تنقید کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دعوی کے مطابق، ثابت شدہ مثال دے کر اس کا علمی تجزیہ کیا جائے۔ اس قسم کا علمی تجزیہ صحت مند علمی سرگرمی کو بڑھاتا ہے۔ وہ صحت مند علمی سرگرمی کو فروغ دینے کا ذریعہ ہے۔ صحت مند تنقید اگر مذہب کے میدان میں ہو تو اس سے لوگوں کے ایمان میں اضافہ ہوگا۔ اسی طرح اگر اس قسم کی تنقید سیکولر میدان میں ہو تو اس سے علم کے میدان میں ترقی ہوگی۔

(تعلیم کی اصل اہمیت یہ ہے کہ تعلیم آدمی کو باشعور بناتی ہے)

امت کی بیداری

امت کی بیداری ایک عام موضوع ہے، جس پر تمام لوگ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ اگر ان تحریروں اور تقریروں کو یکجا کیا جائے تو غالباً سب کا خلاصہ ایک ہوگا، اور وہ ہے امت کو جوش دلا کر عمل پر ابھارنا۔ مثلاً امیر شکیب ارسلان کی کتاب لماذا تأخر المسلمون ولماذا تقدم غیرهم (1939ء)، کا موضوع مسلمانوں میں بیداری لانا ہے۔ مگر پوری کتاب جوش دلانے کے انداز میں لکھی گئی ہے، اس میں کوئی ریشنل پوائنٹ نہیں ہے۔ صرف جوش دلا کر ابھارنے کا انداز ہے۔ اسی طرح اقبال کا کلام مسلمانوں کو جوش دلانے کے انداز میں ہے۔ مثلاً ان کا نمائندہ ایک شعر یہ ہے:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی   حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

یعنی اگر ذوق نغمہ کم ہو گیا ہے تو اپنے گیت کو تیز کر دے۔ اگر اونٹ پر بوجھ زیادہ ہو تو حُدی خواں اپنی لَے اور تیز کر دیتے ہیں۔

ایک امت جب اپنے دورِ زوال میں پہنچ جائے تو جذباتی شعلہ بیانی کا کوئی کام نہیں رہتا۔ اس وقت کرنے کا کام یہ ہوتا ہے کہ افراد کو ذہنی غذا دی جائے۔ افراد کو عروج وزوال کے قوانین بتائے جائیں۔ اس معاملے میں قرآن کی دو رہنما آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔ جان لو کہ اللہ زمین کو زندگی دیتا ہے اس کی موت کے بعد، ہم نے تمہارے لیے نشانیاں بیان کر دی ہیں، تاکہ تم سمجھو (57:16-17)۔ قرآن کی ان آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زوال یافتہ امت کو دوبارہ زندہ کرنے کا آغاز افراد کو خاشع بنانے سے ہوتا ہے، نہ کہ جذبات کی بنیاد پر کئے گئے اقدام سے۔

شخصیت کی تبدیلی

رسول اللہ کے بہت سے اصحاب کے بارے میں کتابوں میں آتا ہے کہ اسلام سے پہلے وہ ایک مختلف انسان تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد وہ بالکل دوسرے انسان بن گئے۔ مثلاً پہلے سخت تھے، تو اب نرم ہوگئے۔ پہلے ان کے اندر نفرت کا جذبہ تھا، تو اب وہ انسان سے محبت کرنے والے بن گئے، وغیرہ۔

صحابہ کے اندر یہ تبدیلی کسی کرامت کی بنا پر نہیں ہوئی، بلکہ معلوم سبب سے ہوئی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے دلوں میں اللہ کا ڈر پیدا ہو گیا۔ پہلے وہ بے فکری کی زندگی گزارتے تھے، اب وہ آخرت کو سوچ کر فکر مند زندگی گزارنے لگے، وغیرہ۔ ان چیزوں کے نتیجے میں ان کے اندر نئی سوچ جا گی۔ وہ آخرت کی جواب دہی کے بارے میں سوچنے لگے۔ ان کے اندر جنت کا شوق پیدا ہوگیا۔ اس طرح ان کے اندر ایک نیا فکری عمل (thinking process) جاری ہو گیا۔ اس فکری عمل کے نتیجے میں دھیرے دھیرے ان کی سوچ بدلی۔ سوچ کی اس تبدیلی کے نتیجے میں وہ تبدیلی آئی، جس کو اب ہم سیرت کی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔

اس طرح کی تبدیلی کسی کرامت کے نتیجے میں نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ وہ فکری انقلاب کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ انسان پہلے ذہن کی سطح پر بدلتا ہے۔ اس کے بعد اس کے اخلاق اور کردار میں تبدیلی آتی ہے۔ آدمی کی فکر میں اگر تبدیلی نہ آئے، تو اس کے اندر عمل کے اعتبار سے تبدیلی بھی نہیں آئے گی۔ آدمی پہلے شعور کی سطح پر بدلتا ہے، اس کے بعد وہ عمل کی سطح پر ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ یہ ایک خاموش پراسس (silent process) ہے، جو ہر اس انسان کی زندگی میں پیدا ہوتا ہے، جو سوچ سمجھ کر اپنی زندگی میں تبدیلی لانے کا فیصلہ کرے۔

ایسے لوگوں کا کیس یہ تھا کہ پہلے وہ بے خبری کی زندگی گزار رہے تھے۔ بعد کو جب انھیں حقیقت کی دریافت ہوئی، تو ان کا ذہن جاگ اٹھا۔ وہ اپنے ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچنے

لگے۔ وہ اپنے بارے میں یہ سوچنے لگے کہ انھوں نے زندگی میں کیا کھویا، اور کیا پایا۔ انھوں نے اپنا محاسبہ شروع کردیا۔ وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ اپنے حال اور اپنے مستقبل پر غور کرنے لگے۔ وہ زیادہ بے لاگ انداز میں اپنا جائزہ لینے لگے۔ اس سوچ نے ان کے اندر ایک فکری انقلاب پیدا کردیا۔ ان کے اندر یہ سوچ پیدا ہوئی کہ اگرچہ انھوں نے اپنے ماضی کو کھویا ہے، لیکن مستقبل اب بھی ان کے پاس ہے۔ ان کو یہ کرنا چاہیے کہ درست پلاننگ کے ذریعے اپنے مستقبل کو بچائیں۔ پیچھے کی بربادی کی تلافی آگے کی نتیجہ خیز پلاننگ کے ذریعے کریں۔ یہی فکر تھی، جس نے ان کو ایک نیا انسان بنادیا۔

صحابہ تمام مسلمانوں کے لیے نمونہ ہیں۔ یہ نمونہ وہ اس لیے نہیں ہیں کہ وہ مقدس تھے۔ بلکہ وہ اس لیے نمونہ ہیں کہ انھوں نے اپنے زندگی کی نئی منصوبہ بندی کی۔ انھوں نے اپنی کمی کو دریافت کیا، انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اور درست منصوبہ بندی کے ذریعے اپنی زندگی کی نئی تعمیر کی۔

☆☆☆☆☆☆☆

خلافت یا نظام صالح کوئی ایسی چیز نہیں جو کاغذ سے نکل کر زمین پر قائم ہوجائے۔ اس دنیا میں صالح نظام کو قائم کرنے کے لیے ہمیشہ صالح افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر صالح افراد موجود نہ ہوں تو خلافت یا نظام صالح کا نام لینے سے کوئی صالح نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ یہ عمل اور نتیجے کے درمیان فرق کا معاملہ ہے۔ اگر آپ پھل چاہتے ہوں تو پہلے آپ کو شجرکاری پر عمل کرنا ہوگا۔ شجرکاری کے میدان میں ضروری عمل کیے بغیر کبھی کوئی شخص پھل کا مالک نہیں بن سکتا۔ یہی معاملہ خلافت یا نظام صالح کے قیام کا بھی ہے۔ کرنے والوں کو سب سے پہلے یہ کرنا ہے کہ وہ افراد کے اندر اعلیٰ ایمانی شعور جگائیں۔ وہ لوگوں کے اندر بلند کرداری پیدا کریں۔ وہ ایسے افراد تیار کریں جو ہر قسم کے نفسانی محرکات سے اوپر اٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرنے والے ہوں۔ جن کے اندر یہ استعداد پیدا ہو چکی ہو کہ وہ اقتدار پا کر بھی متواضع بنے رہیں۔ زمین کے خزانے ان کے ہاتھوں میں آئیں مگر وہ مال کی محبت میں مبتلا نہ ہوں۔ لوگوں کی طرف سے ان کی انا کو چوٹ لگے، اس کے باوجود وہ انصاف کے اصول پر قائم رہیں۔ ایسے افراد ہی کوئی صالح نظام قائم کرتے ہیں۔ ایسے افراد کے بغیر خلافت یا صالح نظام کا نعرہ لگانا صرف فساد فی الارض ہے، نہ کہ حقیقی معنی میں کوئی نتیجہ خیز عمل۔

ذہن سازی

ذہن دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک، علمی ذہن، اور دوسرا وہ جس کو شخصیت پرستی (personality cult) کا ذہن کہا جاتا ہے۔ علمی ذہن وہ ہے جس میں ساری گفتگو علم کی بنیاد پر کی جائے۔ جس میں فیصلے کی بنیاد صرف مسلمہ علم ہو، نہ کہ کوئی اور چیز۔ جس میں مسلمہ علم کی بنیاد پر کوئی چیز قبول کی جائے، اور مسلمہ علم کی بنیاد پر کسی چیز کو ردّ کر دیا جائے۔

جہاں علمی ذہن ہو، وہاں ہمیشہ ذہنی ترقی کا سفر برابر جاری رہتا ہے۔ وہاں ترقی کا سفر کبھی جمود (stagnation) کا شکار نہیں ہوگا۔ یہ مزاج کیا ہے، اس کو برطانوی رائٹر اور نقاد برنارڈ شا نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے— میرا قد شیکسپیئر سے چھوٹا ہے، لیکن میں شیکسپیئر کے کندھے پر کھڑا ہوا ہوں:

Shakepear is a far taller man than I am, but I stand on his shoulders. (The Oxford Companion to Shakespeare, Shaw, George Bernard, p. 499)

اس کے برعکس، شخصیت پرستی کا معاملہ ہے۔ شخصیت پرستی ہمیشہ ذہنی جمود (intellectual stagnation) پیدا کرتی ہے۔ جہاں شخصیت پرستی ہو، وہاں لوگوں کے اندر وہ سوچ پیدا ہوگی، جس کو ایک قدیم جاہلی شاعر، عنترہ بن شداد نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

هَل غادَرَ الشُعَراءُ مِن مُتَرَدَّمِ

کیا شعرا نے کوئی پیوند لگانے کی کوئی جگہ چھوڑی ہے۔ شعرا سے مراد ان کے نزدیک بڑے شاعر تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عرب کے بڑے شعرا نے سب کچھ کہہ دیا ہے، اب کوئی چیز کہنے کے لیے باقی نہیں رہی۔ پرسنالٹی کلٹ کیا ہے۔ کسی مشہور شخصیت کے بارے میں غلو آمیز انداز میں تعریف یا اس سے وابستگی:

Personality cult is excessive public admiration for or devotion to a famous person.

زندہ قوم

جب اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کی وفات (86ھ) ہوئی، تو اس کے لڑکے ہشام نے یہ شعر پڑھا:

فما كان قيس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

قیس کی وفات ایک شخص کی وفات نہیں تھی، بلکہ اس کی وفات سے ایک پوری قوم کی بنیاد ہل گئی۔ یہ سن کر الولید بن عبد الملک اموی نے کہا، چپ ہو جاؤ، کیوں کہ تم شیطان کی زبان سے بول رہے ہو (فإنك تتكلم بلسان شيطان)۔ تم نے یہ کیوں نہیں کہا جو اوس بن حجر نے کہا تھا:

إذا مقرم منا ذر احد نابه تخمط منا ناب آخر مقرم

جب ہم میں سے ایک سردار ہلاک ہو جاتا ہے، تو اس کی جگہ دوسرا سردار آجاتا ہے۔ (الکامل فی التاریخ، بیروت، 1997، 3/532)۔ اسی بات کو ایک اور شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

إذا مات منا سيد قام بعده له خلف يكفي السيادة بارع

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اسلام میں افراد کے لیے بڑے بڑے القاب کا طریقہ نہیں ہے۔ مثلاً آپ اگر ایک شخص کو قائد اکبر کا خطاب دے دیں تو شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ ذہن بنے گا کہ قائد اکبر تو وہی ایک آدمی تھا، اس کے مرنے کے بعد جو لوگ ہیں، سب قائد اصغر ہیں۔ اسی طرح آپ اپنے ایک شخص کو مفکرِ اعظم کا ٹائٹل دے دیں، تو شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ ذہن بنے گا کہ مفکر اعظم تو ایک ہی تھا، اس کے بعد جو لوگ ہیں، وہ سب مفکر اصغر ہیں۔

اسلام میں اخلاقی احترام ہے، اسلام میں شخصی عظمت کا تصور نہیں۔ اسلام میں ایک دوسرے کی خیر خواہی کا تصور ہے، لیکن یہ تصور اسلام میں نہیں ہے کہ کسی ایک شخص کو اکبر اور اعظم جیسا ٹائٹل دیا جائے۔ کیوں کہ اس سے شخصیت پرستی کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔

مشورہ یا باہمی مشاورت

مشورہ ایک دوطرفہ عمل ہے۔ مشورہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک باہمی مشاورت ہے، یعنی دوسرے کو کچھ دینا اور دوسرے سے کچھ لینا۔ مشورہ اگر حقیقی اسپرٹ کے ساتھ کیا جائے تو دونوں پارٹیوں کے لیے ذہنی ترقی (intellectual development) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ مشورہ کی اصل اسپرٹ باہمی مشاورت (mutual consultation) ہے۔

مشورہ میں دو پارٹیاں ہوتی ہیں۔ اس میں بظاہر ایک پارٹی دینے والی (giver) اور دوسری پارٹی لینے والی (taker) ہوتی ہے۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ دوطرفہ لین دین (mutual exchange) کا معاملہ ہے۔ مشورہ صرف مشورہ نہیں، بلکہ وہ باہمی لین دین (mutual exchange) کا معاملہ ہے۔ مشورہ کی صحیح اسپرٹ ہوتو جو بظاہر دینے والا ہے، وہ عین اسی وقت لینے والا بھی ہوگا، اور جو لینے والا ہے، وہ عین اسی وقت دینے والا بھی ہوگا۔

حضرت عمر فاروق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کان یتعلم من کل احد (وہ ہر ایک سے سیکھتے تھے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انٹرایکشن کے وقت وہ باہمی لین دین کی اسپرٹ کے ساتھ انٹرایکشن کرتے تھے۔ اس طرح ہر انٹرایکشن دوطرفہ بن جاتا تھا۔ وہ ہر انٹرایکشن میں دوسرے سے کچھ لیتے تھے، اور عین اسی وقت وہ دوسرے کو کچھ دیتے تھے۔ یہی مطلب ہے میچول کنسلٹیشن کا۔

موجودہ زمانے میں اسی عمل کو ڈائلاگ کہا جاتا ہے۔ ڈائلاگ مباحثہ یا مناظرہ سے الگ ہوتا ہے۔ ڈائلاگ ایک تخلیقی عمل (creative practice) ہے۔ صحیح ڈائلاگ اس وقت وجود میں آتا ہے، جب کہ دونوں پارٹیوں میں اس قسم کی دوطرفہ اسپرٹ پائی جاتی ہو۔ ڈائلاگ اگر مباحثہ اور مناظرہ بن جائے، تو اس سے کسی پارٹی کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس، اگر ڈائلاگ میں دو طرفہ تعلم (mutual learning) کی اسپرٹ موجود ہو، تو ڈائلاگ دونوں فریقوں کے لیے ذہنی ارتقا کا ذریعہ بن جائے گا۔

ری ایکشن کا طریقہ

زندگی کے معاملے میں اصولی بات یہ ہے کہ تشدد کا طریقہ دراصل ری ایکشن کا طریقہ ہے، اور ری ایکشن کا طریقہ کبھی بھی کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمیشہ ایک ری ایکشن کے بعد دوسرا ری ایکشن پیدا ہوتا ہے، اور اس طریق کار کے نتیجہ میں جو چیز وجود میں آتی ہے، وہ چین ری ایکشن (chain reaction) ہے، نہ کہ ری ایکشن کا خاتمہ۔ قدیم زمانے میں ٹرائبل ایج میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ لوگ برابر لڑتے رہتے تھے۔ اسلام نے یہ کیا کہ یک طرفہ طور پر امن کا طریقہ اختیار کرکے چین ری ایکشن کو ختم کردیا۔ اس کے بعد دنیا میں امن کا دور آیا۔

اس سلسلے میں قرآن کی ایک متعلق آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا (41:34)۔ قرآن کی اس آیت میں جس طریقِ کار کا ذکر کیا گیا ہے، اس کو دوبارہ اختیار کیا جائے تو دوبارہ وہی نتیجہ حاصل ہوگا، جس کا مذکورہ آیت میں ذکر کیا گیا ہے، یعنی جو بظاہر دشمن نظر آتا ہے اس کا دوست بن جانا۔

لوگ اکثر اپنے حریف کی شکایت کرتے ہیں۔ لیکن غور کیجیے تو یہ ظلم نہیں ہوتا، بلکہ وہ چین ری ایکشن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے حریف کو پتھر مارا، اس کے بعد اس نے آپ کو بم مارا۔ آپ نے دوبارہ حریف کے خلاف کوئی کارروائی کی، اس کے جواب میں اس نے بھی کوئی کارروائی کی۔ اس طرح ایک چین ری ایکشن شروع ہو گیا، جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

تشدد کا خاتمہ جوابی تشدد سے نہیں ہوتا۔ تشدد کے خاتمہ کی صرف ایک صورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ یک طرفہ طور پر تشدد کی کارروائی کرنا چھوڑ دیں، آپ یک طرفہ طور پر خاموش ہوجائیں، آپ یک طرفہ طور پر امن کا طریقہ اختیار کرلیں۔

(تاریخ کے اکثر نزاعات بدگمانی کی بنیاد پر ہوئے ہیں)

ایک لفظ کا فرق

ایک صاحب جن کی تعلیم ایک مدرسہ میں ہوئی ہے۔ 12 دسمبر 2017 کو ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس سے پہلے 2005 میں میں آپ سے ملا تھا۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ میرے اندر احساسِ کمتری بہت زیادہ ہے۔ اس کا کوئی حل بتائیے۔ میں نے کہا کہ آپ صرف ایک لفظ بدل دیجیے۔ ابھی تک آپ احساسِ کمتری کا لفظ بولتے ہیں۔ آج سے آپ احساسِ غلطی کا لفظ بولنا شروع کردیجیے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ آپ کا سارا معاملہ درست ہوجائے گا۔

آج کی ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ یہ بات آپ نے ایک ڈائری میں لکھی اور وہ ڈائری مجھ کو دے دی۔ اسی وقت سے میں نے اس نصیحت کو پکڑ لیا ہے۔ اب میں یہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ اپنی غلطی کو دریافت کرتا ہوں، اور اس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے سارے معاملات درست ہوگئے۔ گھر کے معاملات بھی، پڑوسیوں کے معاملات بھی، اور مسجد اور مدرسے کے معاملات بھی۔ پہلے میں برابر ٹینشن میں رہتا تھا، اب مجھے کوئی ٹینشن نہیں۔ کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ کسی سے کوئی جھگڑا نہیں۔ اب میں یہ کرتا ہوں کہ کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو میں خود ہی سوچ کر اس کو درست کرلیتا ہوں۔ اب سب لوگ مجھ سے خوش رہتے ہیں۔ جب کہ پہلے ہر شخص کو مجھ سے شکایت ہوتی تھی۔

یہ کرشمہ صرف ایک پرحکمت بات کا تھا۔ وہ یہ کہ اس سے پہلے وہ غلط تقابل (comparison) کا شکار تھے۔ اب انھوں نے احساس کمتری کے جملے کو بدل کر احساسِ غلطی بنا لیا۔ پہلے وہ دوسروں کے خلاف سوچا کرتے تھے، اب وہ اپنی اصلاح آپ کے انداز میں سوچنے لگے۔ بظاہر یہ ایک لفظ کا فرق تھا، لیکن یہ لفظ اتنا زیادہ پرحکمت تھا کہ اس نے ان کی پوری زندگی کو بدل دیا۔ ان کو منفی شخصیت (negative personality) سے نکال کر مثبت شخصیت (positive personality) بنا دیا۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — 265

- جون 30 اور یکم جولائی 2018 سی پی ایس ممبئی ٹیم کے زیر اہتمام ایک دعوتی سفر ہوا۔ اس سفر میں ناگپور، پونے، مالیگاؤں اور اورنگ آباد کے ممبران نے حصہ لیا۔ اسی طرح چنئی سے مولانا حافظ سید اقبال احمد عمری اور گلبرگہ سے مولانا حافظ فیاض عمری صاحبان بھی شریک رہے۔ اس سفر میں چوپڑا شہر کے مشنری اسکول اور ڈگری کالج میں لوگوں سے ملاقات اور انٹرایکشن ہوا۔ ان سے گفتگو انتہائی خوش گوار ماحول میں اور تفصیل سے ہوئی۔ اس کے بعد یکم جولائی کو جلگاؤں میں اقرا ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام چلنے والے H G Thim کالج میں شہر کے مخصوص افراد اور ادارہ کے اسٹاف کے ساتھ دعوتی نشست رکھی گئی۔ اس کے بعد سوال جواب کا سیشن تھا۔ پروگرام نہایت کامیاب رہا۔ حاضرین نے جذباتی تاثرات پیش کئے۔ آخر میں تمام حضرات کو مراٹھی قرآن اور دوسرے دعوتی لٹریچر دئے گئے۔ دونوں جگہ الرسالہ کے قارئین پر مشتمل دعوتی ٹیم بھی تیار کی گئی ہیں۔
- 3 جولائی 2018 کو مز شبنم پوپٹ (ساؤتھ افریقہ) نے صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کے لیے دہلی کا سفر کیا۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز کی کتابیں اور ترجمہ قرآن پڑھا ہے، اور اس سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ سفر کیا تھا۔ کافی دیر تک صدر اسلامی مرکز سے ان کا انٹرایکشن ہوا۔ انھوں نے جب اپنے سچائی کی تلاش کا قصہ سنایا تو جذباتی ہوگئیں اور رونے لگیں۔ انھوں نے وزیٹر رجسٹر میں اپنا تاثر ان الفاظ میں نقل کیا:

  Maulana's books have brought peace and guidance to me, I thank him deeply, His knowledge and guidance are extremely helpful.
- 15 جولائی 2018 کو سی پی ایس جمشید پور کے جناب ایاز احمد کے گھر پر محکمہ بجلی کے دو ملازمین مسٹر اومیش کمار اور مسٹر پپو کمار میٹر ریڈنگ کے لیے آئے۔ ان کی نظر بک اسٹینڈ پر رکھے ہوئے ہندی ترجمۂ قرآن پر پڑی۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا یہ برائے فروخت ہیں۔ جب ان کو بتایا گیا کہ نہیں، یہ آپ کے لیے بطور اسپریچول گفٹ ہے، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ جب ان کو قرآن کا ہندی ترجمہ اور ہندی کتابچہ جیون کا اُدیش دیا گیا، تو انھوں نے بہت ہی خوشی کے ساتھ ان کو لیا، اور شکریہ ادا کیا۔
- 13 جولائی 2018 کو امریکا کے مسٹر مائیکل نے صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ اس وقت خواجہ کلیم الدین صاحب (سی پی ایس امریکا) اور شفیع احمد ڈار صاحب (کشمیر ٹیم) بھی موجود تھے۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے عالمی امن پر اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ آخر میں ان کو قرآن اور دوسرے دعوتی لٹریچر دیئے گئے، جو انھوں نے بخوشی قبول کیا۔ مسٹر مائیکل امریکا کی ایک یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ہیں۔
- 17 جولائی 2018 کو زی سلام کے پروگرام ''راہِ نجات'' میں سی پی ایس سہارن پور کے سرپرست ڈاکٹر محمد اسلم خان نے لوگوں کو کنفیوزن سے نکلنے کے لئے یہ مشورہ دیا کہ وہ صدر اسلامی مرکز کی کتابیں پڑھیں، خاص طور پر

انگلش کتاب ''اِن سرچ آف گاڈ''۔ اس کے بعد 22 جولائی 2018 کو ڈاکٹر محمد اسلم خان نے اپنی فیملی کے ساتھ بنگلور کا سفر کیا۔ اس سفر میں انھوں نے بنگلورسی پی ایس ٹیم کے ساتھ دعوتی ملاقات کی۔ اس وقت مس سارہ فاطمہ اور مولانا عنایت عمری کے زیر انتظام بنگلور اور سہارنپور ٹیم نے دعوہ اکسپیر ینس شیئرنگ کے لئے ایک میٹنگ بنگلور میں منعقد کی گئی۔ ڈاکٹر محمد اسلم خان نے اجتماع کو خطاب کیا اور سوالات کے جواب دئے۔

- 23 جولائی 2018 کو دی پالیسی ٹائم نے صدر اسلامی مرکز کا اسلام، امن اور ہندستانی مسلمانوں پر ایک اہم انٹرویو لیا۔ صدر اسلامی مرکز نے اسلام کی پر امن تعلیمات کو واضح کیا۔ ساتھ ہی ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں بتایا کہ اب تعلیم اور امن پسندی کی طرف ان کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ان کا معیار زندگی پہلے کے مقابلے میں کافی بہتر ہوا ہے۔ لہذا ان کے مستقبل کے تعلق سے کسی طرح کا اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں۔
- ملیشیا کی موجودہ حکمراں جماعت کے ٹریزرر مسٹر ہوسم موسی (Husam Musa) صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کے لئے 23 جولائی 2018 کو اسلامی مرکز کی آفس نظام الدین ویسٹ آئے۔ ان سے عالمی مسائل اور امن کے تعلق سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ آخر میں ان کو صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک سٹ دیا گیا، نیز ملیشیا کے موجودہ وزیر اعظم ماثر بن محمد کے لئے صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک سٹ انھیں دیا گیا۔
- ڈاکٹر رفیق انجم نے حال ہی میں اسلامک اسٹڈیز میں اپنی پی ایچ ڈی یونیورسٹی آف کشمیر (سری نگر) سے پروفیسر نسیم احمد شا کی زیر نگرانی مکمل کی ہے۔ ان کی ریسرچ کا موضوع ''ریلیجس تھاٹ آف مولانا وحید الدین خان — این اینالیٹکل اسٹڈی'' تھا۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز کے نظریات اور ان کے مشن کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے، نیز موجودہ حالات میں دوسرے علماء اور اسکالرس کے مقابل صدر اسلامی مرکز کے نظریات کے ریلیونس پر روشنی ڈالی ہے۔
- ذیل میں پاکستان میں موجود الرسالہ قارئین کے تاثرات نقل کیے جارہے ہیں:

◁ مجھے بہت غصہ آتا تھا۔ اکثر مایوس بھی ہوجاتا تھا۔ 2012 میں مولانا کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اس سے مجھے زندگی بسر کرنے کا ایک نیا ولولہ ملا۔ خصوصاً فلسفہ اعراض (avoidance) نے مجھے کئی بار غلط فیصلوں سے بچایا ہے۔ وقت کی قدر بھی مجھے مولانا کی تصانیف سے حاصل ہوئی۔ (فضل الرحمن، لاہور)

◁ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا صاحب کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے جو تاثیر رکھی ہے وہ اب بہت ہی کم لوگوں میں پائی جاتی ہے، مولانا صاحب کی ہر بات سائنس اور تجربے کی بنیاد پر ہی ہوتی ہے، ہر بات انسان کے احساسات اور جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہوتی ہے، جس سے سننے والے پر گہرا اثر پڑتا ہے اور مثبت تحریک ملتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا صاحب کو ہمیشہ صحت منداور توانا رکھے آمین۔ (محمد فرحان، کراچی)

◁ مولانا صاحب کی تحریروں کا اثر ہے کہ اب میں عام طور پر بولنے سے پہلے سوچتا ہوں کہ کیا بولنا چاہیے، اور کتنا بولنا

ہے۔(ندیم خان، کراچی)

- مولانا کی تحریروں نے میری زندگی میں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں: (1) وقت کو پہچان کر درست وقت پر درست اقدام کرنا۔ وقت کی حقیقت۔ وقت کی طاقت۔ لہٰذا میں ہر طرح کے وقت کا شکر گزار بنتا جارہا ہوں۔ (2) کائنات میں موجود اشیاء کی قیمت کا اندازہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اب میں زیادہ قیمت کی چیز کی قیمت کم اور کم کی زیادہ قیمت نہیں لگاتا۔ (3) سب سے بڑھ کر یہ سیکھا کہ ''صبر'' سب سے بڑی ''تحریک'' ہے۔ جزاک اللہ۔ (عادل درانی، ہری پور)
- مولانا صاحب سے میں نے یہ سیکھا کہ صبر بزدلی کا نام نہیں، صبر بہادری کا نام ہے، صبر ایک ایسی طاقت ہے جسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ (ابوبکر، فیصل آباد)
- مولانا سے تعارف کا میرا رشتہ زیادہ پرانا نہیں ہے، بلکہ وہ تقریباً تین سالوں پہ محیط ہے، اور اس وقت میری لائبریری میں مولانا کی تقریباً بیس کتابیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک اہم کتاب رازِ حیات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کئی موٹی ویشنل (motivational) بکس کا مطالعہ کیا اور تقاریر بھی سنیں، مگر مولانا کا کام بے مثل ہے۔ اس کتاب سے میرے اندر نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ اس کتاب سے ایک سبق جو مجھے ملا ہے، وہ یہ ہے کہ تصادم کی فضا کو چھوڑ کر عمل اور امن کی راہ اختیار کرنا ہے۔ اس کتاب کو ایک بار مکمل پڑھ لینے کے باوجود اسے روزانہ پڑھنا میرا معمول ہے۔ اب تک تقریباً سو سے زائد لوگوں کو اس کتاب کے پڑھنے پر آمادہ کر چکا ہوں۔ (عثمان غنی رعد، اردو ڈیپارٹمنٹ، نمل، اسلام آباد)
- پاکستان میں الیکشن سے پہلے میں سیاسی مباحثوں میں پڑ گیا تھا۔ ان مناظروں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر منفی توانائیاں پروان چڑھ رہی ہیں۔ اُن دنوں میں بہت ڈپریس رہا، اور اس کے اثرات الیکشن کے بعد بھی میرے ذہن پر نقش تھے۔ اب دوبارہ میں نے مولانا کی تحریریں پڑھنا شروع کر دی ہیں، اور میں واضح طور سے محسوس کر رہا ہوں کے میرے وجود اور میرے رویے سے مثبت توانائیاں پھر سے خارج ہونا شروع ہو گئیں ہیں۔ (محمد نوید، کے پی کے)
- مجھے مولانا سے صحیح فہم دین ملا، اور عملی طور پر میرا کردار تعمیر ہوا، شخصیت سازی ہوئی۔ سوچنے، غور کرنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ یوں سمجھیے کہ مثبت و تعمیری سوچ پیدا ہوئی۔ ان سے میں نے صبر سیکھا، اور شکر سیکھ رہے ہیں۔ معرفت خداوندی عطا ہوئی۔ خود آگہی ہوئی، اپنے آپ کی پہچان عطا ہوئی۔ دنیا پرستی سے گریز اور آخرت پرستی کے شوق نے جنم لیا۔ ذوق مطالعہ پیدا ہوا۔ بہت سی چیزوں کے نئے مفہوم کا ادراک حاصل ہوا۔ بس تجربات اتنے زیادہ ہوئے کہ چند سطروں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ کبھی کہیں کوئی نشست جمی اور بیان کا موقع ملا تو ضرور اظہار خیال کروں گا۔ (خواجہ مظہر نواز صدیقی کالم نگار روزنامہ نوائے وقت ملتان)

▷ I used to consider religion as more of an external change in society than an inner discovery. Maulana was the person who taught me that religious journey begins as a discovery by the mind and proceeds to the development of a purified personality.I never thought that complaining over oppression, injustice, discrimination and accusing others of evil in the world are negative aspects of thinking which deprive us of all virtues of positive thinking. After reading and listening to Maulana, I have tried to do away with negative thinking. Doing this I have realized that I am very calm. Earlier, I used to stick to a literal and technical interpretation of scriptures. Maulana taught me that we have to learn to read and understand scripture by understanding the nature of Man, and that there are seas of lessons in the Quran for someone prepared to contemplate. I used to think that meditation is the path to spirituality. Maulana taught me that contemplation is the path to spirituality. He is the one person who completely changed my worldview. (Mohammad Talha, Lahore)

▷ Recently, a traffic warden stopped me for not having driving license. Instead of getting angry, I went the next day to procure my license. I realized that I was driving without having permission from the state, although I am answerable to God in regard to following state rules. This major shift in my attitude came after listening to Maulana's lectures. Second, I learned to practice avoidance of confrontation whenever there is a conflict of interest. Third, I learned that spirituality lies not in meditation or yoga, rather it is attained through observation and contemplation of things around us, for example, trees and their mechanism of growth, the variety of products yielded by the same soil. All this shows God's greatness, which increases gratefulness and love for God. (Ansa Riaz, Islamabad)

• رمضان کے موقع پر سی پی ایس پاکستان نے دعوت کے تعلق سے جو عہد اور پلاننگ کی تھی، وہ ہر ایک کے لیے اس قابل ہے کہ وہ اس قسم کی کوششیں کرے، اور خدا کے پیغام کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلانے میں اہم کردار ادا کرے۔ انھوں نے جو پلاننگ اور عہد کیا تھا، وہ یہ ہیں:

▷ Ramzan is the month of the Quran. In this month, we are launching a new initiative to take our mission to the next level towards fulfilling our core responsibility of continuing the Prophetic Mission, i.e., Dawah Work. We will be setting up a separate organization, or NGO, only for the purpose of Dawah work. Its task would be to educate people about Dawah work and its importance in current times and to engage in Quran distribution in Pakistan and around the world. We

will be joining hands with CPS International and CPS USA to reach out to the world. Quran translations are already available in 27 languages. We need to engage people in Pakistan for Dawah work and will be using their connections in the world to disseminate the Quran all over the world. Last year, in Turkey alone 100,000 Quran copies were distributed in various languages. In India, CPS International is already doing Dawah in various states. In the US, Khaja Kaleemuddin Sb and Viqar Alam Sb are doing Quran distribution since past several years, but the demand is very high and we need more helping hands. I spoke to Dr. Saniyasnain Khan Sb from CPS International and he told me that he is receiving so many requests from all over the world that he needs to double the amount of printing and distribution. We learned through our experience at Book Fairs and interaction at various places that Dawah according to the Quranic concept is not well-known to people here and they are not familiar with this idea. We need to work here to explain the importance of Dawah work through literature and then engage people to participate in distributing Quran and supporting such activities. We have a very big plan in this regard—we will be connecting with people, building our offices in all cities, supporting the work of translation of the Quran in remaining languages, printing and distribution of copies of the Quran and providing support to all new Daees. We believe that Allah will make this enormous task easy for us, Inshallah. To start this work we need your full support. We will be requiring active members for this organization who will be involved in this work and we will also need people to support this initiative. We will be updating you with our work requirement and will need your guidance and support. The starting point is to finalize the name of the Organization. We recommend the following names: 1.Dawah International 2.Quran for Everyone 3.Quran for Peace. Please suggest more names (we will check the domain availability). Let us pray to Allah for guidance and for the success of this mission. Salaam (Tariq Badar, Coordinator, CPS Pakistan)

- ہر ہفتہ صدر اسلامی مرکز کا تین تربیتی پروگرام ہوا کرتا ہے۔ بروز سنیچر (5:30pm)، بروز اتوار (10:30am)، نیز ہفتے میں کسی ایک دن (8:00pm)۔ ان تمام پروگراموں کو فیس بک (Facebook) پر لائیو (live) نیز بعد میں سنا جا سکتا ہے، اور لائیو سنتے ہوئے کمنٹ باکس میں تاثرات اور سوال بھی کیے جا سکتے ہیں۔ ان تمام پروگرام کو فیس بک پر سننے کے لیے ایڈریس ہے : www.facebook.com/maulanawkhan

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2018-20
Published on the 1st of every month
RNI 28822/76
Posted at NDPSO
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2015-17